مطبوعہ
اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد
۱۹۴۲ء

فہرست مضامین ریاض مختاریہ سلطنت آصفیہ

باب اول

ضمیمہ

القاب سلاطین آصفیہ بعد رحلت

۱ ۔ آصف جاہ بہادر اول
مغفرت مآب

۲ ۔ میر نظام علیخاں بہادر آصفجاہ ثانی
غفران مآب

۳ ۔ سکندر جاہ بہادر آصفجاہ ثالث
مغفرت منزل

۴ ۔ ناصر الدولہ بہادر آصفجاہ رابع
غفران منزل

۵ ۔ افضل الدولہ بہادر آصفجاہ خامس
مغفرت مکان

۶ ۔ میر محبوب علیخان بہادر آصفجاہ سادس
غفران مکان

القاب میر تراب علی خاں بہادر مختار الملک مغفور مندرجہ ریاض مختاریہ

نواب صاحب مغفور مغفور اوّل مغفور سالار جنگ اعظم

میر محمد کاظم
محمد علی خان
رضا یار خان
تقی یار خان
محمد صفدر خان
شیخ محمد تقی
شیخ اویس ثانی

دیباچہ

حمد و ثنا ایسی کرتا ہوں اس خلاق جہاں کی جس کے نظام عالم کو دیکھ کر حکمائے کاملین و انبیائے مبین کی عقل حیران ہے۔ اگرچہ کما حقہ دیکھنے اور سمجھنے کے لائق بصیرت و ادراک کسی کو کہاں ہے جل جلالہٗ عظم شانہٗ۔ مگر ہاں! وہ سمجھ سکتا ہے جس کو خلاق عالم نے اپنے نور پاک سے بنایا ہے۔ اور بصیرت و ادراک کامل سے سرفراز فرمایا ہے۔ یعنی سالار انبیا محبوب خدا احمد مختار محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ الاطہار و اصحابہ الاخیار وسلم۔

بعد حمد ایزد پاک و نعت شہ لولاک واجب ہے دعا و ثنائے پادشاہ عہد ولی نعمت رعایا پرور عدل گستر منبع فیض و عطا۔ معدن رحم و سخا نواب مستطاب عالی جناب **فتح جنگ نظام الملک آصف جاہ سابع ظل اللہ اعلیٰ حضرت**

والسلام۔ پروردگار کیوں نہ شاد و آباد رکھے گا کہ اس ریاست میں پرورش اُس کے بندوں کی ایسی ہے کہ کسی ریاست میں نہیں ہے۔

بعد دعا و ثنائے شاہ ذی جاہ نیز لازم ہے ستائش وزیر سلطنت کی۔ **وزیر** بھی وہ جس کے اوصاف جد مغفور کا نمونہ یہ کتاب ہے۔ کتاب نہیں بلکہ ابواب اوصافِ موصوف میں کا ایک باب ہے۔ یعنی نیر آسمان امارت و وزارت معدن مراحم و مروت۔ ذکی الطبع کریم النفس سخن شناس نکتہ رس **ملولفہ** ؎

از خیال و بدکلام واقف   آقا و مربی مولف

وزیر ابن وزیر ابن وزیر ابن وزیر ابن وزیر ابن وزیر ابن وزیر سلطنت آصفیہ عالی جناب نواب **میر یوسف علی خاں** سالار جنگ بہادر دام اللہ اقبالہ۔

واہ کیا عہد بابرکت ہے کہ یہ شاہ ذی جاہ نوجوان با عقل ہیں تو وزیر بھی تازہ جوان باتمیز ہیں۔ وہ شہریار قدر داں تو یہ [illegible] دیوان۔ وہ خدیو سلطنت و دولت تو یہ دستور ارسطو فطرت۔ وہ دریا دل [illegible] رعایا پرور تو یہ [illegible] عدل گستر۔ وہ مہر سپہر منزلت آصف جاہی یہ نجم [illegible] پرور دیوان خاندان منیر الملک خلد آرام گاہی۔

حافظ حقیقی اس شاہ و **وزیر** کو ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں خوش و خرم اور عدل گستری و رعایا پروری میں شہرۂ عالم رکھے ؎

خدایا ز چشم بداں دور باد
بد اندیشِ شاں خوار و مقہور باد

کسی سفر کا سفرنامہ تک نہ لکھا۔ منشی محمد صدیق صاحب ناظم دفتر ملکی نے جو مختصر سفرنامہ لندن
کا لکھا ہے جس کو ان کے عزیزوں نے سفرنامہ مختار الملک مغفور قرار دے کر طبع کرایا ہے
وہ دراصل سفرنامہ منشی صاحب موصوف کا ہے کیونکہ اس میں جس قدر اپنی سرگزشت
مفصلاً لکھی ہے اس قدر مغفور کے حالات نہیں۔ بسا تواریخ چھوٹ گئی ہیں کہ ان میں
مغفور کا مطلق ذکر نہیں ہے۔ نواب خان خاناں بہادر، سیدی عنبر خانساماں وغیرہ
ہمراہیانِ مغفور سے اکثر حالات مغفور کے سنے گئے ہیں اور مرقعہ عبرت میں مندرج ہیں جو
سفرنامہ مذکور میں نہیں ہیں۔ پس ایسی حالت میں مولوی سید حسین صاحب بلگرامی،
نواب عماد الملک بہادر نے جو مغفور کے دلی خیرخواہ اور معتمد خاص و واقف کار تھے بعد
وفات نواب صاحب مغفور مختصر سوانح عمری مغفور کی [illegible] انگریزی میں جو تالیف کی
ہے جس کا ترجمہ مولوی مہدی حسن فتح نواز جنگ بہادر مرحوم نے اردو میں کرکے **مرقعہ عبرت**
نام رکھا ہے۔ وہ نہایت اعلیٰ و عمدہ تالیف ہے [illegible] ابتدائی حالات اور بدانتظامی زمانہ
سابق و زیر باری ریاست کی کیفیت اور واقعات [illegible] انتظام ملک میں
از ابتدائے مدار المہامی تا زمانہ وفات جس قدر محنتیں اس وزیر باتدبیر نے اٹھائی ہیں
اور جاں فشانیاں کی ہیں وہ سب مرقعہ عبرت میں مختصر و مفید بیان کی گئی ہیں۔ ان
میں سوء انتظام زمانہ سابق کا بیان بھی مختصر ہوا ہے حالانکہ وہ جس قدر مفصل بیان
کیا جائے مناسب تر ہے تاکہ اس وزیر باتدبیر و وفادار کی کارگزاریاں اہل زمانہ حال
و آئندہ پر بخوبی انکشاف پائیں اور اس وزیر مغفور کی جاں فشانی ہائے سی سالہ کا (جو

سببِ تالیف کتاب

جس وقت سنہ ۱۳۰۰ھ میں مختار الملک مغفور اوّل نے رحلت کی تو سب کو یہ خیال تھا کہ جب تک یہ ریاست ابد مدت قایم ہے اس وزیر باوفا کی جاں فشانیاں بھولی نہ جائیں گی۔ لیکن اس تیس برس کے عرصہ میں جو غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ خیال محض خیال تھا۔ کیونکہ جو مسن لوگ ملک کی خستہ حالی سابق کا معائنہ کئے ہوئے تھے سن طبعی کو پہنچ کر اکثر اُٹھ گئے اور اُٹھے جاتے ہیں۔ جو حضرات زمانہ مابعد کے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قدیم سے ملک کی یہی حالت تھی جو اس وقت ہے۔ فقط اتنا خیال ہے کہ مختار الملک مغفور دانشمند وعقیل مدار المہام گزرے ہیں۔ بلکہ بعض ناواقفوں کا خیال یہ ہے کہ غیر ملکیوں کو اس ملک میں مغفور نے بھر دیا اور عہدوں پر مسلط کر دیا جس کے باعث اہل ملک کو کوئی خدمت نصیب نہیں ہوتی ہے۔ اس خیال کی بر طرفی تو باب دوم میں اس مقام پر ہوگی جہاں صنعت بنتی کا ذکر آئے گا۔ نہ افسوس ہے کہ مغفور موصوف نے رفاہِ عام ملکی میں جو مشقتیں اٹھائی ہیں اور جو خون جگر تیس سال پیا ہے وہ ایسا نہ تھا کہ اس قدر جلد بھولا جائے۔ بلال الدولہ مرحوم۔ ناظم الدولہ مرحوم۔ صدیق یار جنگ مرحوم ناظم دفتر ملکی۔ حکیم باقر نواز جنگ مرحوم۔ حکیم حیدر نواز جنگ مرحوم۔ سید عبد الوہاب صاحب مرحوم داروغہ باورچی خانہ وغیرہ۔ متوسلین و ملازمین جو سفر و حضر میں حاضر رہتے تھے ان میں سے۔ تعجب ہے کہ کسی نے سوانح عمری نواب صاحب مغفور کی مفصل لکھنے کا خیال نہ کیا۔ اگر لکھی جاتی تو ایک تاریخِ عمدہ و تالیف فرخندہ مرتب ہوتی۔ حتیٰ یہ کہ

والد مولّف کو جو اہلِ زبان و نہایت خوش لہجہ، خوش بیان تھے اتالیقی و تعلیم زبان فارسی کے لئے نواب میر تراب علی خاں بہادر سالار جنگ کی خدمت میں متعین فرمایا تھا۔ والدِ مرحوم کے اشعار جو کچھ مرقوم تھے طغیانی رود موسیٰ میں نذ بہت و اثاث البیت تلف ہو گئے۔ چند شعر غزل کے جو مولّف کے حافظے میں محفوظ رہے سو یہ ہیں ؎

چوں جانب گلشن رود آں گلبدن من | خواہم کہ شود خاک رہش جان و تنِ من
باغیرتو ہر گہ بہ تماشا بخرامی | از رشک بہ تن چاک شود پیرہن من
آں خنجر شرکانت چناں بر جگرم خورد | خوں تا بہ صفِ حشر چکد از کفن من

سیّدؔ تو مکن نالہ و فریاد ازیں بیش
شاید کہ بہ دادِ تو رسد ذوالمنن من

والدِ مرحوم فرماتے تھے کہ یہ غزل حسب ایمائے مغفور کہی گئی تھی۔ بجواب غزل محمد اعظم علی خاں امید۔

الحاصل خیال یہ ہے کہ مآثر الامرا۔ حدیقۃ العالم۔ مرقعہ عبرت رشید الدین خانی۔ خورشید جاہی۔ سوانح عمری امیر علی ٹھک۔ رسالہ تالیف اللہ بیج تا بخیال۔ رسالہ امانی علاقہ برار۔ رسالہ خصوصیات اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ۔ ہدیہ مہدویہ۔ رویداد حیدرآباد دکن۔ موازنہ بابتہ ۱۲۸۰ف جو ابتداءً بحکم مغفور اول مرتب ہوا تھا۔ نو بہار دکن۔ تاریخ دکن۔ مجموعہ قصاید و تواریخ عہد ارسطو جاہ مرحوم جس کا دیباچہ شاہ تجلی نے لکھا ہے۔ ایضاً مجموعہ بابت عہد

محض خیر خواہی سلطنت و رفاہِ عام میں کی ہیں) مقتضا بھی یہی ہے کہ جملہ اہل ملک اس خیر خواہ
رئیس و رعایا کی ریاضتوں کو ہمیشہ قدر دانی کی نظر سے دیکھا کریں اور بہ آگاہی حالات
بدنظمی زمانہ سابق و بملاحظہ حسن انتظام و فرط آرام زمانہ حال مغفور کو دعائے خیر کے ساتھ یاد
کریں هل جزاء الاحسان الا الاحسان۔

مگر افسوس ہے کہ کمترین مولّف کو اس تالیف کی ضرورت نے ایسے بے سر و سامانی
کے وقت مجبور و مامور کیا ہے۔ کاش چند سال قبل انتقال مغفور اس امر کی توفیق ہوتی
کہ اُس وقت آلام و آفاتِ دنیوی و ضعفِ پیری سے دل و دماغ مولّف کے محفوظ تھے۔
عہد وزارت مغفور ممدوح تھا۔ باخبران کبیر السّن موجود تھے۔ حالات اول و آخر باطمینان
کامل فراہم و تالیف ہونے کی امید تھی۔ مگر اب کیا کیا چاہیئے۔ کُل کے افسوس میں جزو کو
بھی ہاتھ سے دینا خلاف عقل و دانش ہے۔ لہذا کمترین ہیچ مداں کج مج زباں نمک
پروردہ موروثی سرکار عالی۔ وابستہ قدیمی در دولت سالارجنگی میر دلاور علی دانش ابن آقا
سید علی رشتی مرحوم المتخلص بہ سید نے باوصفِ عدم لیاقت و پریشان خاطری و ضعفِ
پیری اس کام پر نظر بخدا کمر ہمت باندھی ہے۔ لفظ رشتی سے مراد یہ ہے کہ مولّف کے
والد ماجد ملکِ رشت سے تھے جو منجملہ بلاد ایران ہے۔ بہ سن ہجدہ سالگی اواخر عہد
مغفرت منزل میں آکر ملازم سرکار عالی و شریک دربار شعرائے مہاراجہ مدار المہام
متوفی ہوئے۔ تاآں کہ ہمراہ مدار المہام خدمت سراج الملک بہادر میں آئے سو بسبب اسی
در دولت سے مدت العمر خود مع اولاد وابستہ و متوسل رہے۔ سراج الملک بہادر نے

مرد دانا بہر چہ در نگرد — عیب بگذارد و ہنر نگرد
ہست در عیب ہا ہنر بینی — از میان صدف گہر چینی

مقدمہ واضح ہو کہ طبع نازک شاہاں متحمل زحمات شاقہ نہیں ہوتی ہے اس لئے انتظام سلطنت کا بار **وزیر** کے سر ہوتا ہے چنانچہ وزیر کے معنے بار اٹھانے والے کے ہیں۔ اب رہا انتخاب وزیر تو وہ بھی حسب مناسبت ہر زمانہ بہت اچھا ہوا ہے:—

(۱) حیدر یار خاں بہادر شیر جنگ منیر الدولہ منیر الملک اول
(۲) سید موسیٰ خاں بہادر نصیر جنگ رکن الدولہ
(۳) محمد صفدر خاں بہادر غیور جنگ اشجع الدولہ اشجع الملک خانخاناں
(۴) سہراب جنگ معین الدولہ مشیر الملک اعظم الامرا ارسطو جاہ بہادر
(۵) سید ابو القاسم میر عالم بہادر
(۶) علی زماں خاں بہادر غیور جنگ منیر الدولہ منیر الملک ثانی
(۷) راجہ راجگان مہاراجہ چندو لعل بہادر
(۸) فخر الدین خاں شمس الامرا امیر کبیر بہادر
(۹) عالم علی خاں بہادر شیر جنگ سراج الدولہ سراج الملک

سلطنت آصفیہ کے یہ جملہ دیوان و وزرائے موصوف ماقبل مختار الملک مغفور اول منتظم و مدبر گذرے ہیں۔ ہر ایک نے خیر خواہی آقا میں بقدر امکان جاں فشانی کی ہے اور داد وفاداری دی ہے۔ از آں جملہ مشہور تر رکن الدولہ بہادر ارسطو جاہ بہادر

میر عالم مرحوم موسوم بہ بستان سخن ایضاً بابتہ عہد منیر الملک مرحوم موسوم بہ اوصاف منیر۔
ایضاً بابت عہد مختار الملک مغفور اول موسوم بہ حدیقہ مختاریہ۔ سفرنامہ منشی محمد صدیق موسوم
بہ سفرنامہ مختار الملک مغفور اول، وغیرہ کتب کتاب خانہ علاقہ سرکار فیض آثار نیر اعظم
آسمان امارت۔ سراج منیر دودمان وزارت در ثمین بحر فیض و کرم۔ سالار زماں امیر
عالم۔ یوسف مصر عزت و اقبال۔ ماہ منیر فلک جاہ و جلال عالیجناب **نواب**
میر یوسف علی خاں بہادر سالار جنگ **طال اللہ عمرہ و دام اقبالہ**
مدار المہام سرکار عالی سے جو بہ دولت مہتممی کتاب خانہ موصوف مؤلف کو میسر ہیں مدد لی
جائے۔ نیز ابتدائے سن شعور سے خود مؤلف نے جو کچھ معاینہ کیا ہے اور قدیم بزرگوں سے
سنے ہوئے حالات زمانہ سابقہ جس قدر یاد ہوں لکھے جائیں کہ شاید آئندہ کسی سے
یہ بھی ممکن نہ ہو۔

پہلے زمانہ سابق یعنی قبل مدار المہامی مغفور موصوف جو حالت اس ملک کی ظاہراً
وباطناً تھی اس کا نقشہ حتی الامکان کھینچا جائے کہ اصل مقصود بھی اس تالیف سے
یہی ہے تاکہ اہل زمانہ حال و آئندہ پر منکشف ہو کہ ملک کی حالت کیسی ہو گئی تھی اور
اس کو مختار الملک مغفور اول نے بکمال جاں فشانی و ریاضت کیا کر دکھایا ہے اور نام اس
کارنامہ کا **ریاض مختاریہ بہ سلطنت آصفیہ** مناسب جانا اور اس میں
ایک مقدمہ دو باب ایک ضمیمہ قرار دیا۔ ناظرین کی نیک نفسی سے امید ہے کہ اگر
کوئی سہو و خطا اس میں پائیں گے تو معاف فرمائیں گے کہ ہیچ فرد بشر خالی از خطا نبود۔

خدمت دیوانی کا جائزہ لیا الخ یعنے جد کو پدر لکھا ہے اور پدر کو بھائی ۔ منیر الملک ۱۲۲۴ھ میں مدار المہام ہوئے جو مرقوم ہے اس میں بھی تأمل ہے کیونکہ مرقعۂ عبرت وغیرہ تواریخ سے اور قطعہ تاریخ من جملہ کتاب اوصاف منیہ سے ۱۲۲۳ھ ثابت ہے ۔ قطعہ مذکور ضمیمہ میں لکھا جائے گا ۔

جب متاخرین کے احوال کا یہ حال ہے تو کوائف متقدمین کی کیا کیفیت ہوگی چنانچہ اس کے اوپر میر موسیٰ خاں رکن الدولہ مرحوم کی نسبت یہ لکھا ہے کہ ۱۱۸۹ھ میں قتل ہوئے ۔ ان کے قتل ہونے کے بعد نواب وقار الدولہ خدمت دیوانی کو انجام دیتے تھے مگر فیضو نامی ایک سپاہی نے انہیں قتل کیا الخ حالاں کہ تواریخ میں مذکور اور دکن میں مشہور ہے کہ رکن الدولہ بہادر کو فیضو نامی کاردی نے قتل کیا ہے نہ کہ وقار الدولہ کو ۔ باوجودیکہ مولف موصوف نے بقول خود بستان آصفیہ کی تالیف میں سالہائے سال بڑی بڑی زحمتیں اٹھائی ہیں اس پر یہ کیفیت ہے ۔ اصل یہ ہے کہ سہو و خطا لازمۂ بشری ہے خصوصاً تالیف و تصنیف نہایت نازک و سخت مشکل کام ہے اور ہر ایک شخص اس کام کا اہل ہو نہیں سکتا ۔ بہرحال جس قدر حالات حکام و آثار وغیرہ قدیم جدید دکن بستان آصفیہ میں ہیں ایسے کسی میں نظر نہیں آئے ۔ یہ تاریخ اپنے ہمعصر تواریخ سے بڑھی ہوئی ہے ۔ مولف نے واقعی بڑی زحمت اٹھائی ہے ۔

مولف ہیچ مداں نے یہ چند جزء جو لکھے ہیں معلوم کئے ہوئے کچھ حالات زمانۂ قبل مدار المہامی نواب صاحب مغفور کے ہیں اور کسی قدر کیفیت خاندان مغفور کی او

میر عالم بہادر ہیں، اور ان وزرا کی خلاصہ جاں فشانیاں اور کارِ نمایاں از روئے تواریخ جس قدر مولف کی نظر سے گزرے ہیں، بر محل و مقام ہر یک بیان کئے جائیں گے۔
اس میں شک نہیں کہ یہ وزرا کارگزاری و جاں نثاری میں بے مثل تھے لیکن نواب صاحب مغفور نے رئیس و ریاست کی بہبودی و ترقیٔ دولت کو باتحملِ مصائب و کاہشاتِ روحی، جان پر کھیل کر درجہ کمال تک جو پہنچایا ہے اور ریاستِ ضعیف جاں بلب کے حق میں تائید الٰہی جو مسیحائی کی ہے اس امرِ عظیم میں نواب صاحب مغفور آپ اپنی نظیر تھے۔ بعد معائنۂ حالات ہر ایک ناظرین معدلت آئین خود انصاف فرما سکتے ہیں۔ اس تفصیلِ وزرا میں از روئے سنین سلسلہ برابر نہو یا ان کے سواء اور کوئی وزیر مستقل کا اسم رہ گیا ہو تو مولف معذور ہے کیونکہ تفصیل وزرا سلسلہ وار صحیح طور پر کہیں نظر نہیں آئی۔ بستانِ آصفیہ جو حال میں طبع ہوئی ہے اس کے مولف مانک راؤ وٹھل راؤ نے بھی اس بارے میں کچھ ایسا ہی عذر کر کے تفصیل وزرا بتلائی ہے جس پر اعتمادِ کامل ہو نہیں سکتا۔ مقامِ غور ہے کہ مولف موصوف حیدرآبادی اور منیر الملک بہادر و سراج الملک بہادر وزرائے سلطنت آصفیہ میں سے جن کا زمانہ حال کا، اُن کی نسبت صفحہ ۱۳۹ بستانِ آصفیہ میں لکھا گیا ہے کہ نواب میر عالم بہادر کے بعد اُن کے داماد اور نواب سالار جنگ اعظم کے پدر عالی قدر نواب منیر الملک بہادر ۱۵ رجب ۱۲۲۴ھ کو مدار المہام ہوئے الخ۔ اس کے دوسرے صفحہ میں مرقوم ہے کہ ۱۷ ذیقعدہ ۱۲۶۲ھ کو سراج الملک نے جو منیر الملک مدار المہام کے بھائی اور سالار جنگ اعظم کے چچا تھے

مجملاً احوال حضرت خواجہ اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ

سرسلسلہ دودمانِ عالیشان نواب مختار الملک سرسالارجنگ مغفور اول

تذکرۃ الاولیا مولفہ حضرت شیخ فریدالدین عطار قدس سرہٗ اور تاریخ روضۃ الصفا وغیرہ سے معلوم ہوا کہ ملک یمن میں ایک موضع کا یا ایک سردار قبیلہ کا نام قرنؔ ہے اُس سے منسوب خواجہ اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ تھے یہ مشہور عاشق نادیدہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور ولی کامل بارگاہ احدیت کے تھے جن کے اوصاف حمیدہ تذکرۂ موصوف وغیرہ سے بہت کچھ عیاں ہیں یا محتاج بیان نہیں۔ تمام عالم میں مشہور اور فریقین میں مذکور ہیں۔

جناب شاہِ اولیا علی ابن ابی طالب علیہ التحیتہ والثنا جس وقت عازم جنگ صفین ہوئے تو خواجہ اویس قرنی رحمۃ اللہ آخر عمر میں بکمالِ شوق شرف ملازمت و ذوقِ سعادتِ شہادت خدمت مبارک میں شاہِ اولیا کی حاضر وقدم بوس ہوئے۔ جناب شاہ اولیا بھی اس بزرگ کی ملاقات سے نہایت خوشنود ہوئے اور تعظیم سے پیش آئے۔ تاآں کہ وہ ولی خدا یعنے حضرت خواجہ اویس قرنی بہ نصرت ورفاقت جناب شاہ اولیا علیہ التحیتہ والثنا جنگ مذکور میں درجۂ شہادت پر فائز

عہد مدارالمہامی مغفور موصوف کی ہے۔ ضمناً متقدمین کا کچھ ذکر آگیا ہے سو وہ از روئے تواریخ وغیرہ بقدرِ امکان تحقیق کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ برایں ہم اگر کوئی غلطی وقوع میں آئے تو عجب نہیں کہ مولّف بھی انسان ہے اور ضعیف۔

مختصر احوال ملّا احمد نایت مرحوم

قبیلۂ بنی قریش کے شرفائے مدینہ منورہ جو بخوف ظلم حجاج بن یوسف ظالم وطن چھوڑ کر نکل گئے اور ۱۵۲ھ ہجری میں بذریعہ جہاز بندر کوکن علاقہ دکن میں آکر مقیم ہوئے تھے۔

لفظ نایت کی تحقیق تاریخ مآثر الامرا سے یہ ہوئی ہے کہ ابتدائً اہل کوکن وغیرہ ان تازہ واردوں کو نوآمد یا نوآمدہ کہنے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ کثرت استعمال سے مخفف و محذوف ہو کر نایت قرار پایا۔ الحاصل اُن کی اولاد میں سے ملّا احمد نایت تھے جو بوجہ علم و فضل و کمال و ذکاوت و قابلیت والیٔ بیجاپور علی عادل شاہ ثانی ابن سلطان محمد عادل شاہ کے موردِ عنایات ہو کر تھوڑے عرصہ میں رکن رکین ریاست و مدار المہام سلطنت ہو گئے۔ بعد ازاں کسی وجہ سے ملازمت علی عادل شاہ موصوف سے برداشتہ خاطر ہو کر بہ تمنائے ملازمت عالمگیر بادشاہ مع فرزند روانۂ ہندوستان ہوئے تھے۔ بادشاہ موصوف نے بھی خبر پاکر بہ کمال قدردانی ان کے مصارفِ راہ کے لئے دو لاکھ روپیے اور ان کے فرزند کے لئے پچاس ہزار روپیے بذریعہ راجہ جے سنگھ جو بالشکر گراں منجانب بادشاہ موصوف دہلی بہ قصد بیجاپور آیا تھا۔ مرحمت فرمائے تھے۔ اور عطائے منصب شش ہزاری و شش ہزار سوار مع خطاب و

ہوئے رحمۃ اللہ علیہ۔

اُن کی اولاد میں ملقب و موسوم بہ شیخ اویس دو بزرگ اور ہوئے ہیں۔ ایک شیخ اویس ثانی، دوسرے شیخ اویس ثالث۔

مآثر الامرا۔ تزک آصفی۔ حدیقۃ العالم۔ نظام الانساب وغیرہ تواریخ سے ظاہر ہے کہ ۱۶۵۶ء میں بقولے ۱۶۷۲ء مطابق ۱۰۶۷ھ میں شیخ اویس ثالث جو مدینہ طیبہ کے متولی اوقاف تھے اور اُس زمانہ میں وہ بہترین خدمت وہاں کی تھی۔ مع یک فرزند شیخ محمد علی نام مدینہ طیبہ سے نکل کر چندے بحرین میں رہے پھر وہاں سے دریا کی راہ سے بندر کوکن میں آئے جو کہ سمت جنوب دکن کنارہ دریائے شور واقع ہے۔ بعد ازاں کوکن سے روانہ ہو کر بیجاپور میں وارد ہوئے تو پادشاہ عہد علی عادل شاہ ثانی ابن سلطان محمد عادل شاہ ابن سلطان ابراہیم عادل شاہ نے اُن کے مقدم خیر کو مغتنمات سے سمجھ کر بہ کمال اصرار اپنے پاس رکھا اور اُن کی نہایت تعظیم و تکریم کرتا تھا۔ اُن کے لئے قریب درگاہ قدم رسول ایک مکان عالیشان تعمیر کر دیا تھا۔ شیخ محمد علی موصوف کو زیور قابلیت سے آراستہ پاکر عہدۂ دبیری سے ممتاز کیا اور یہ عہدہ اُس وقت میں بہت جلیل سمجھا جاتا تھا۔ ان کا باقی احوال آئندہ پر رکھا گیا ہے۔ پہلے مختصر حال ملا احمد نایت اور درگاہ قلی خاں سالار جنگ کا بیان کر دینا مناسب ہے کیونکہ یہ ہر دو بزرگ خاندان عالی شان سر سالار جنگ مغفور اول سے تعلق رکھتے ہیں، اور آئندہ برمحل ان ہر دو معززین کا ذکر آئے گا۔

عہدۂ جلیلہ کا غائبانہ وعدہ سرفرازی فرمایا تھا۔لیکن ملا احمد موصوف نے احمد نگر تک پہنچ کر وفات پائی۔ گویا ان کی خاک نے کہا' یہ احمد نگر ہے' اپنے نگر میں آکر اب کہاں جاتے ہو یہیں رہ جاؤ۔

ان کا فرزند محمد اسد حسب فرمان عالم گیر بادشاہ کی حضوری میں پہنچ کر منصب ہزار و پان صدی ہزار سوار و خطاب اکرام خاں وغیرہ عطایا سے سرفراز ہوا۔

درگاہ قلیخان بہادر سالار جنگ مؤتمن الدولہ مؤتمن الملک خاندوران

۱۱۲۲ھ ۱۱۸۰ھ

مجملاً احوال درگاہ قلیخاں سالار جنگ مرحوم

واضح ہو کہ نواح مشہد مقدس میں ایک قبیلہ ترکوں کا موسوم بپور بورالوس خاناں نسبیہ خیمہ ہے اُس قبیلہ سے درگاہ قلی خاں سالار جنگ ابن خاندان قلیخاں ابن نوروز قلیخاں ابن درگاہ قلیخاں ابن خاندان قلیخاں تھے۔ خاندان قلیخاں کو صوبہ دار کشمیر علی مردان خاں نے بکمال اعزاز و اکرام اپنے پاس رکھا تھا۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو ان کے فرزند درگاہ قلیخاں کو بہ اعانت علی مردان خاں موصوف پیشگاہ شاہ جہاں پادشاہ سے منصب و جاگیر بہ نواح ٹھٹہ مرحمت ہوئی۔ نیز خدمت میر سامانی سرکار علی مردان خاں متعلق ان سے تھی۔

علی مردان خاں کی رحلت کے بعد شہزادہ اورنگ زیب کے متعین منصب داروں میں مقرر ہو کر ہمراہ رکاب شہزادہ موصوف دکن میں آئے۔ پھر دکن سے ہندوستان واپس جا کر رحلت کی۔ ان کا فرزند نوروز قلی خاں قلعہ داری قلعہ دار دار علاقۂ بیجاپور سے سرفراز ہو کر وہیں فوت ہوا۔ اُن کا فرزند خاندان قلی خاں منصب و جاگیر سے ممتاز ہو کر منصب داران متعین اورنگ آباد میں مامور ہوا اور عہد شاہ عالم خلد منزل میں وقایع نگاری سنگمنیر اور فوجداری محالات پر وہاں کے ممتاز ہوا۔ نواب آصف جاہ طاب ثراہ نے اپنے عہد میں اپنی خاص خدمتوں پر مامور فرمایا۔ ان کے خلف الصدق درگاہ قلی خاں

سالار جنگ بتاریخ ۲۹ ر ماہ رجب ۱۱۲۲ھ سنگمنیر میں متولد ہوئے۔ جب چودہ[۱۴] برس کا سن ہوا تو نواب آصفجاہ مغفرت مآب نے انہیں منصب و جاگیر سے سرفراز فرمایا۔ جب بیس[۲۰] برس کا سن ہوا تو اپنے اسٹاف میں شریک فرماکر اکثر کام اپنی پیشی کے لینے لگے۔ انھوں نے ان خدمات کو کمال خوبی سے ادا کیا جس کے باعث تادم آخر مورد عنایات مغفرت مآب رہے۔ ماہ جمادی الآخر ۱۱۶۳ھ میں کوتوال بلدہ خجستہ بنیاد ہوئے۔ معرکۂ نادرشاہی میں ہمراہ رکاب رہ کر حد سے زیادہ جاں فشانیاں کیں۔ عہد نظام الدولہ ناصر جنگ بہادر میں بھی سربرآوردہ رہے۔ عہد امیر الممالک نواب صلابت جنگ میں منصب شش ہزاری اور خطاب مؤتمن الدولہ و صوبہ داری اورنگ آباد سے کامیاب ہوئے۔ جب جملہ حکومت دکن ذات آصفجاہ ثانی سے متعلق ہوئی تو منصب ہفت ہزاری و ماہی و مراتب و خطاب مؤتمن الملک کا مرتبہ حاصل کیا۔ نیز عماری دو جہالردار کا اختصاص پایا اور ۱۱۷۵ھ میں مخاطب بہ خاندوراں ہوئے۔ بعد قتل راجہ بہادر جو دریائے گنگا کے کنارے واقع ہوا تھا۔ اور شاہی چھاؤنی خجستہ بنیاد میں پڑی تھی تو بکمال کرم و مرحمت نواب آصفجاہ ثانی نے مع محلات مبارک ان کی حویلی میں فروکش ہوکر چندے اقامت فرمایا تھا۔ بعد ازاں بمقتضائے دور فلک جو یکساں نہیں رہتا غرہ ماہ رجب ۱۱۹۰ھ کو صوبہ داری اورنگ آباد سے معزول ہوکر پنجم ماہ ذیحجہ سنہ مذکور کو بہ کمال تحمل اپنی جاگیر نظام آباد میں جاکر بیٹھ گئے۔ بعد ازاں پھر بحالی کے اسباب مہیا ہو رہے تھے کہ مرض سرسام سے بتاریخ ۱۸ ر ماہ جمادی الاولے ۱۱۹۱ھ

امام قلیخان بہادر خان عالم

۱۲۳۰ھ

رحلت کی ۔ ان کی میت کو نظام آباد سے اورنگ آباد میں لاکر ان کے والد کے مقبرے میں دفن کیا ۔

درگاہ قلیخاں اور شیر جنگ بہادر آبائی امراے دربار شاہی سے تھے متعین ہوکر ہمراہ آصفجاہ بہادر دکن میں آئے تھے ۔ الحاصل درگاہ قلیخاں مرحوم موصوف امیر ذیجاہ دانش آگاہ خلق و رحم وکرم و شجاعت و ذکاوت میں بے مثل تھے ۔ ان کی سواری جس میں الغوزہ نواز بھی رہتے تھے نہایت باتجمل ہوتی تھی ۔ ان کے دو فرزند اور ایک دختر تھیں ۔ ایک امام قلیخاں دوم وصی قلی خاں ۔ بعد انتقال درگاہ قلیخاں مرحوم ہر دو فرزند موصوفین بتوجہ و امداد شیر جنگ مغفور بپیشگاہ آصفجاہ ثانی سے سرفراز ہوئے یعنی امام قلیخاں اکبر فرزند بہ ارث پدری خطاب مؤتمن الملک سالار جنگ خان عالم و جاگیر ذات علاقہ برار و خجستہ بنیاد میں ۔ وصی قلیخاں بخطاب درگاہ قلیخاں خاں زماں و جاگیر ذات علاقہ مذکور سے سرفراز و ممتاز ہوئے ۔ دختر درگاہ قلی خاں مسماۃ بہجت بیگم جو بطن صبیہ حنیف الدین خاں علیہ الرحمہ سے تھیں ان کا ذکر احوال محمد صفدر خاں بہادر غیور جنگ میں آیندہ آئیگا ۔

اب یہاں سے بقیہ احوال فرزند خواجہ اویس ثالث یعنی شیخ محمد علی کا بیان کرنا لازم ہے کہ بیجاپور میں ملا احمد نایت مدار المہام علی عادل شاہ ثانی نے جس کا حال اوپر بیان ہوچکا ہے ۔ اپنی دختر عفیفہ شیخ محمد علی موصوف دبیر خاص علی عادل شاہ ثانی کو دی ۔ شیخ محمد علی موصوف مرحوم نے ایک حمایل قلمی خوشخط جو اپنے فرزند محمد باقر مرحوم

دو فرزند تھے ایک شیخ محمد باقر دوم شیخ محمد حیدر۔ شیخ محمد باقر کو سرکار علی عادل شاہ موصوف میں خدمت میر سامانی عطا ہوئی۔ اور شیخ محمد حیدر کو عہدہ مستوفی الممالک کا مرحمت ہوا۔ یہ دونوں بھائی عہد سکندر عادل شاہ تک بیجاپور میں اپنے عہدوں پر قایم تھے۔ بعدازاں جب مصطفیٰ خاں وزیر سکندر عادل شاہ سے ناسازی پیدا ہوئی تو عالمگیر پادشاہ کی خدمت میں عرضداشت روانہ کی اور حسب الطلب پادشاہ موصوف یہ ہر دو برادر شرف اندوز دربار عالمگیر پادشاہ ہو کر شیخ محمد باقر منصب دو ہزاری پانصد سوار فوجدار و دیوانی دارالخلافت شاہ جہاں آباد و کشمیر سے سرفراز ہوئے۔ اور شیخ محمد حیدر منصب ہزار و پانصدی سہ صد سوار و عہدہ دیوانی فوج پادشاہزادہ محمد اعظم شاہ سے ممتاز ہوئے۔ اور ایک مدت تک ان خدمات پر مقرر تھے تاآنکہ شیخ محمد باقر نے بتوسل اسد خاں وزیر اعظم معروضہ گذرانا کہ آب و ہوائے ہندوستان فدوی کے ناموافق ہے امیدوار ہوں کہ دکن پر متعین کیا جاؤں۔ بادشاہ نے براہِ عنایات معروضہ پذیرا فرمایا اور دیوانی کل دکن نظام شاہی و عادل شاہی پر معمور فرما کر رخصت فرمایا۔

شیخ محمد باقر نے دکن میں آکر بہ کمال معتبری بسر کی۔ آخر عمر میں خدمت سے مستعفی ہو کر اورنگ آباد میں سکونت اختیار کی اور تاحیات جاگیر ذات بحال تھی تاآنکہ ۱۱۲۵ھ میں رحلت کی۔ یہ مرحوم علوم معقول و منقول میں عالم جید اور صاحب تصنیفات و متقی و زاہد تھے۔ کتاب تلخیص المرام فی علم الکلام نیز روضۃ الابرار

کو ہبہ کیا تھا وہ حمایل کتاب خانہ سرکار نواب سالار جنگ بہادر حال میں موجود ہے
بنظر اختصار صرف مہر کی نقل یہاں کر دی گئی ہے جو خاتمہ عبارت ہبہ پر ثبت ہے
وھوھذا (مہر: محمد علی شیخ اویس ۱۰۶۲) الحاصل اس بی بی کے بطن سے شیخ محمد علی کے

ے ایک کلام اللہ حمایل قلمی خط کتاب خانہ نواب سالار جنگ بہادر میں موجود ہے جس کو شیخ محمد علی موصوف مرحوم نے اپنے فرزند محمد باقر کو ہبہ کیا تھا۔ اور محمد باقر نے اس کو وقف کر کے اس کا متولی اپنے برادر زادہ محمد رضا ابن محمد حیدر کو قرار دیا تھا۔ اس جملہ عبارت عربی مرقومہ حاشیہ حمایل موصوف معہ دو مہر کی نقل یہ ہے۔

بر حاشیہ کلام اللہ

وھبت ھذا المصحف المجید لولد الرشید محمد باقر طال عمرہ وبقاوہ ووقع الایجاب والقبول والقبض والاقباض وصار ملکاً لہ وفقہ اللہ تعالیٰ تلاوتہ مع شرایط

انا الفقیر محمد علی ابن المرحوم شیخ اویس طاب ثراہ

(مہر: محمد علی شیخ اویس)

قد دخل فی ملکی بھبۃ ابی وانا الفقیر الی اللہ الغنی

محمد باقر ابن شیخ محمد علی بیض

وقفت ھذا المصحف المجید علی جمیع المومنین والمومنات والمسلمین والمسلمات الموجودین والموجودات والمتولدین والمتولدات قربۃ الی اللہ وجعلت نفسی الناظر والمتولی علیہ ما کنت حیا وبعد وفاتی النظر والتولد علیہ لمحمد رضا ابن اخی المرحوم محمد حیدر بعد والواقف محمد باقر ابن شیخ محمد علی ابن شیخ اویس الاویسی نسباً والاوقافی لقباً بیض (مہر: محمد باقر علی ابن شیخ محمد)

وزبدۃ الافکار علم حکمت وغیرہ میں ان کی تصانیف سے ہیں۔ ملا محمد فصیح تبریزی نے کتاب مذکورہ دوم کا یہ نام رکھا ہے۔ ان کے فرزند شیخ محمد تقی کو عہد عالمگیر پادشاہ میں سہ صدی اور عصر بہادر شاہ میں پانصدی منصب پنجاہ سوار تھے۔ عہد محمد فرخ سیر میں داروغہ جزیہ خجستہ بنیاد ہوئے۔ جب نواب مغفرت مآب آصفجاہ حکومت دکن پر آئے تو پیشگاہ نواب ممدوح سے داروغگی احتشام جملہ قلعہ جات دکن مرحمت ہوئی تا آنکہ ۱۱۳۵ھ م ۱۷۲۲ء میں مرحوم ہوئے۔

حیدریار خان بہادر شیر جنگ منیر الدولہ منیر الملک

۱۱۱۳ھ ۱۱۸۹ھ

خلاصہ حال حیدر یار خاں بہادر شیر جنگ نیر الدولہ نیر الملک اوّل

شیخ محمد تقی موصوف مرحوم کے فرزند شمس الدین محمد حیدر المخاطب بہ حیدر یار خاں بہادر شیر جنگ نیر الدولہ نیر الملک اول سردار نواب صاحب مغفور اوّل کے ۱۱۱۳ھ مطابق ۱۷۰۱ء میں متولد ہوئے۔ ان کا مادہ تاریخ عالی بخت ہے صغیر سنی میں منصب صدی عالمگیری سے سرفرازی پائی۔ جب سن تمیز کو پہونچے تو ملازمت میں نواب آصفجاہ کی پہونچ کر منصب دوصدی و داروغگی فیلخانہ سے سرفراز ہوئے۔ بعد انتقال والد باضافہ صدی منصب ان کا سہ صدی تک پہونچا تھا۔ نواب مغفرت مآب دکن سے عازم شاہ جہاں آباد ہوئے تو شمس الدین محمد حیدر ہمراہ رکاب تھے۔ تقرب روزافزوں ہوتا گیا تاآنکہ خدمت عرض بیگی کا اعزاز حاصل ہوا۔ بعد جنگ نادر شاہی ۱۱۵۲ھ میں منصب شش صدی و خطاب حیدر یار خاں سے ممتاز ہو کر ایسے معتمد علیہ و مشار الیہ ہوئے کہ نواب مغفرت مآب جب کبھی حضوری میں شہنشاہ کی جاتے تھے تو سوائے حیدر یار خاں موصوف اور درگاہ قلیخاں کے کسی تیسرے کو ہمراہ نہ لیجاتے تھے۔ شاہ جہاں آباد سے جب دکن میں واپس آئے تو بعد معرکۂ ناصر جنگ و تسخیر قلعہ ترچناپلی منصب حیدر یار خاں کا ہفت صدی ہشت صد سوار تک پہونچا۔ عہد مظفر جنگ میں منصب ہزار و پانصدی

کرتے تھے۔ اور یہ سب کے ساتھ بزرگانہ شفقت فرماتے تھے۔ رکن الدولہ بہادر انہیں اپنا بزرگ جانتے تھے اور عمو صاحب کہتے تھے۔ بجائے خط کے ان کو عرضی لکھتے تھے۔

منیرالملک بہادر اول کے دو فرزند تھے۔ کلاں محمد صفدر خاں بہادر غیور جنگ اشجع الدولہ جن کا مفصل حال بعد ذکر رکن الدولہ بہادر بیان کیا جائے گا۔

چھوٹے فرزند نقی یار خاں بہادر ذوالفقار جنگ کو دیوانی و امانت پایباقی و تحصیلداری مطالبہ وغیرہ صوبہ برار ۱۱۹۴ھ میں ہوئی تھی۔ بعد انتقال والد اپنے برادر کلاں موصوف کے ظل عاطفت میں ساٹ سال زندہ رہ کر بعارضۂ فالج لاولد انتقال کیا۔

پانصد سوار تک ترقی کی۔ اور امیر الممالک صلابت جنگ کے زمانے میں اولاً منصب پنجہزاری چہار ہزار سوار پالکی جہالدار و علم و نقارہ و خطاب نیر الدولہ شیر جنگ بہادر دوبارہ باضافہ دو ہزاری منصب ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار و ماہی و مراتب وخطاب نیر الملک و خدمت میر سامانی سرکار والا سے نامور ہوئے۔ بعد از ان دیوانی صوبجات دکن سے ۱۱۶۸ف میں سرفراز ہوئے چنانچہ اسناد دو مہری عہد نیر الملک وغیور جنگ جو ہیں وہ دیل ہیں ان کی اس خدمت پر۔

نواب آصفجاہ ثانی کے عہد میں اگرچہ بسبب کبر سنی امور وزارت سے کنارہ کش ہوئے تھے اور زمانہ اوایل مدار المہامی رکن الدولہ بہادر کا تھا۔ جب بھی اکثر امور سترگ حسب صلاح و مشورت نیر الملک بہادر موصوف طے ہوتے تھے۔ مقدمات متعلقہ سرکار پنڈت پردہان پیشوا و محمد علیخاں والاجاہ بہادر میں سوال و جواب حسب رائے صاحب بہادر موصوف لکھے جاتے تھے۔

بسبب کبر سنی جب قوہ نہایت ضعیف ہو گئے تو ترک خدمت کر کے اورنگ آباد میں منزوی ہو گئے تھے۔ تو بھی بندگان عالی آصفجاہ ثانی کے اصرار سے اورنگ آباد کی نظامت کو قبول کر کے باقی عمر کے پانچ سال بہ کمال عدل وغربا پروری و فیض رسانی بسر کئے اور ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۷۶ء میں بعمر ہفتاد و ہشت سال رحلت کی۔

ان کے اوصاف حمیدہ و خصایل پسندیدہ۔ ماثر الامرا۔ تزک آصفی۔ حدیقۃ العالم وغیرہ تواریخ سے ظاہر ہیں۔ اس عہد کے تمام امرا ان کا احترام و اعزاز خوردانہ

بعدازاں انہیں خیمہ قیام میں لے گئے مگر خیمہ میں پہونچنے تک روح پرواز کر گئی۔
ان کا یادگار یہاں ایک چشمہ واقع بیرون فتح دروازہ موسوم بہ رکن الدولہ کا
بم ہے اور بوجہ خوشگواری وخوبی آب بلدہ میں مشہور اور نگرانی سرکار عالی میں ہے
کیونکہ اس چشمہ سے آب خاصہ شاہی جایا کرتا ہے۔ کسی نے یہ تاریخ بنائی چشمہ مذکور
خوب کہی ہے **قطعہ**

چو آں رکن دولہ بنام حسینؑ | بناکرد ایں چشمۂ فیض عام
پے سال تاریخ گفتہ خرد | بخور آب سردی بیاد امام

۱۱۸۴ھ

بالائے کوہ شریف مولا علیؑ بھی تین چبوتروں پر مختصر عمارتیں پختہ ان کے
نام سے مشہور ہیں۔ بعض کہتے ہیں راجہ راؤ رنبھا جیونت متوفی کی بنوائی ہوئی ہیں۔

مجملاً ذکر نواب میر موسیٰ خاں بہادر احتشام جنگ رکن الدولہ[1]

سید محمد ترکیخاں کلید برداران روضہ رضویہ مقدسہ میں سے جب ہند میں آئے تو بلحاظ علم وفضل ترکیخاں موصوف کو نواب فیروز جنگ بہادر نے اپنے فرزند آصفجاہ بہادر کی معلمی پر مقرر فرمایا۔ بوجہ لیاقت خان موصوف اور ان کی اولاد نے ترقی کی تا آنکہ ان کے پوتے میر موسیٰ خاں رکن الدولہ بہادر ۱۱۷۷ھ میں دیوان ہوکر جانفشانی وخیرخواہی نواب نظام علیخاں بہادر غفران مآب میں جو کہ عین جنگ وجدال کا زمانہ تھا کمی نہ کی۔ مآثرالامرا۔ حدیقۃ العالم وغیرہ تواریخ سے معلوم ہوا کہ ۱۱۸۹ھ میں بمقام موضع نبیر جب کہ غفران مآب عماری سے اتر کر محلسرائے میں تشریف لے گئے اور رکن الدولہ بہادر کوئی واقعات عرض کرنے کے لئے خیمہ میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ فیضو نامی گاردی نے رکن الدولہ بہادر کے بائیں پہلو میں کٹار سے ایسا مارا کہ خون کا فوارہ جاری ہوگیا۔ یہ واقعہ سن کر غفران مآب برآمد ہوئے تو رکن الدولہ بہادر باوجود زخم کاری کھانے کے ایک ساعت تک کلمات خیرخواہی دولت ووصایا عرض کرتے رہے

---

[1] رقعہ جات شاہ نواز خاں صمصام الدولہ سے معلوم ہوا کہ رکن الدولہ کا نصیر جنگ خطاب تھا۔

مجملاً ذکر محمد صفدر خاں بہادر غیور جنگ اشجع الدولہ و اشجع الملک[1]

شیر جنگ نیر الملک بہادر اوّل کے فرزند کلاں اشجع الملک بہادر موصوف جو پرداد انواب صاحب مغفور کے تھے بتاریخ ۲۴ ماہ جمادی الاخری ۱۱۴۵ھ م ۱۷۳۲ء متولد ہوئے ۔ عہد مغفرت مآب میں منصب دوصدی و نیابت داروغگی فیلخانہ سے سرفراز ہوئے ۔ مظفر جنگ بہادر کے عصر میں منصب پانصدی چارسوسوار

نوٹ ۔ یہاں ایک علٰحدہ کاغذ چسپاں ہے جس پر حسب ذیل قطعات تاریخ لکھے ہوئے ہیں ۔ مصنف کا نام نہیں ہے ۔

[1] اشجع الملک اشجع الدولہ — خان خاناں بدل غلام بتول
از سر آہ سال رحلت او — حشر او بشود با آل رسول
۱۴ شعبان سنہ ۱۲۰۲ھ

تاریخ انتقال محمد حیدر مخاطب بہ نیر الملک (ربیع الاخری)

" حیدر یار خاں با ایمان " ۱۱۸۹ھ

" حیدر یار خاں عادل " ۱۱۸۹ھ

اُم خان عالم والا نژاد — کرد رحلت از قضا فریاد وداد
سال تاریخش بہ تربیت شد رقم — خوابگاہِ بیگم جنت نہاد
۳۰ ۲؛ ۶

محمد صفدر خان بہادر غیور جنگ اشجع الدولہ اشجع الملک خانخانان

۱۳۰۴ھ
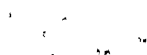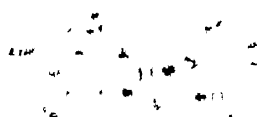
۱۱۴۵ھ

وخطاب خانی سے اور زمانۂ نواب امیرالممالک صلابت جنگ بہادر میں اولاً کوتوالی
خجستہ بنیاد سے بارِدوم منصب سہ ہزاری دو ہزار سوار وعلم و نقارہ وخطاب بہادری سے

حاشیہ صفحہ گزشتہ۔

بیگم کالی لقب عالی گہر قدسی جناب — رفت ازیں دار فناور قرب رب العالمیں
مصرع تاریخش از عرش بریں آمد چنیں — مرقدِ پرنور بیگم جلوۂ روئے زمیں
۱۲۴۱ھ

آرامگاہِ خان دوران
۱۱۸۰ھ

اہل عالم سینہ چاک از ماتمِ سالار جنگ
۱۱۸۰ھ

رحمت النساء خانم اہل خانہ خان زمان — جان بحق تسلیم کردند از دنیا بہ عالم جاودان
۱۲۷۳ھ

فغان از جہان شد امیر کبیر — بدرد و الم خویش ہمسایگان
چو کردم بدل فکر تاریخ او — شدہ میر علیخان بہ مینو مکان
۱۲۲۸ھ

خلفِ موتمن الدولہ امیر والا — ہمخطاب پدرِ خود بزبانِ عالم
کردر حلت زجہان ہاتف غیبی فرمود — جائے فردوس بود بودن خان عالم
۱۲۳۰ھ

ولہ درخلوت جنوں کہ دلم آرمیدہ است ٭ خود راز گیر و دار حوادث کشیدہ است
حاشا کہ آشنائے شکایت شود لبم ٭ از قسمت است انچہ زیاراں رسیدہ است
از میکدہ بردں نروم تا ظہور حشر ٭ ساقی مرا بساغر و مینا خریدہ است
زاہد ترا بہ میکشی ما چرا حسد ٭ مارا خدا برای ہمیں آفریدہ است

ان کی شادی درگاہ قلیخاں سالار جنگ موصوف کی دختر بہجت بیگم عرف بھجو بیگم سے ہوئی تھی جو کہ بطن دختر حنیف الدین خاں علیہ الرحمۃ سے تھیں جس کا نسب شریف ابراہیم ادہم قدس سرہٗ تک منتہی ہوتا ہے۔ اس عفیفۂ زمان کے بطن سے محمد صفدر خاں غیور جنگ مرحوم کے چار فرزند اور دو دختریں تھیں۔ ایک دختر مسماۃ فرزند بیگم صاحبہ تھیں جن کی شادی سپہدار جنگ سیف الدولہ بہادر عرف مالی میاں فرزند ارسطو جاہ بہادر سے ہوئی۔ ان کے بطن سے جہاں پرور بیگم صاحبہ تھیں۔ ان کی شادی بعہد نواب نظام علیخاں بہادر ولیعہد سے یعنی نواب سکندر جاہ بہادر سے ہوئی ان کے بطن سے میر پادشاہ فرزند اور دو دختریں تھیں ایک غفور النسا بیگم صاحبہ جو ناکتخدا فوت ہوئیں دوسری۔ نامدار النسا بیگم صاحبہ ان کی شادی نواب ناصر الدولہ بہادر نے ایک منصبدار میر ابوالقاسم المخاطب بہ نصیب الدولہ بہادر شیعی مذہب سے کردی کیونکہ یہ مرشدزادی شیعہ تھیں اور یہ معاہدہ ہوا تھا کہ جہاں پرور بیگم صاحبہ کے بطن سے جو فرزند ہو اپنے آبائی مذہب پر رہے۔ اور دختر اپنی والدہ کے مذہب پر چنانچہ میر پادشاہ حنفی تھے۔ دختر دوم مالی میاں

بارسوم بعہد غفران مآب نظام علیخاں بہادر سنہ ۱۱۷۴ھ مطابق سنہ ۱۷۶۰ء میں منصب چہار ہزاری و خطاب غیور جنگ بہادر اشجع الدولہ سے جس کا مصرع تاریخ

خطاب اشجع الدولہ ہمایوں

ہے سرفراز ہوئے۔ بار چہارم منصب پنجہزاری چہار ہزار سوار و پالکی جھالردار سے سرمایۂ افتخار حاصل کیا اور منصب ششہزاری ششہزار سوار۔ اس کے بعد بتاریخ ۲۸ ماہ رمضان سنہ ۱۱۹۷ھ مطابق سنہ ۱۱۹۴ف خدمت آبائی دیوانی صوبجات دکن اور خطاب اشجع الملک سے اور بتاریخ ۸ ماہ صفر سنہ ۱۲۰۴ھ مطابق سنہ ۱۷۹۰ء خطاب خانخاناں سے سرفراز ہوئے۔ بتاریخ ۱۴ ماہ شعبان سنہ ۱۲۰۴ھ جب کہ شاہی چھاؤنی پانگل میں تھی بعارضہ خفقان وغیرہ مرحوم ہوئے۔ مادہ تاریخ رحلت مندرجۂ تزک آصفی یہ ہے۔

حشر او می شود بآل رسول۔

ان کی میت کو اورنگ آباد لیجا کر ان کے والد شیر جنگ مرحوم کے مقبرہ میں دفن کیا۔
ان کی نسبت اہل تاریخ لکھتے ہیں کہ متانت و بردباری و غیرت و مروت و وضعداری و پاس دوستی و رحم و غربا پروری میں بے مثل تھے۔ اور مدعا نویسی و فن نظم میں نہایت صاحب امتیاز تھے۔ یہ چند طبعزاد ان کے ہدیہ ناظرین ہیں ؎

سحر چو برق بت سرخ پوش رفت و گذشت ⁂ بیک کرشمہ او عقل و ہوش رفت و گذشت

طریق عشق ز پروانہ مینواں آموخت ⁂ کہ سوخت جان عزیز و خموش رفت و گذشت

کی امت اسلام بیگم صاحبہ تھیں جو شہیار الملک بہادر سے بیاہی گئیں۔

دوم دختر غیور جنگ بہادر کی فاطمہ بیگم صاحبہ ان کی شادی میر سید و فرزند ماہ بیگم عرف مہا بیگم اورنگ آبادی سے ہوئی۔ ان کے بطن سے نجیب النسا بیگم عرف مغل صاحبہ بی پیدا ہوئیں جن کو نعل کچہری کا کام تھا۔ ان کی شادی محمد عیسیٰ خاں ابن میر محمد سعید سعید الدولہ کلاں سے ہوئی۔ بعد انتقال شوہر ایک زمانے کے بعد لاولد رحلت کیں سنہ ۱۲۸۰ھ یا سنہ ۱۲۸۱ھ میں یہ مرحومہ نہایت نیک و عابدہ تھیں۔ کیفیت چہار فرزندان موصوف یہ کہ بعد رحلت والد جاگیرات چاروں فرزندوں پر علی السویہ تقسیم ہوی۔ فرزند کلاں اکرام الملک محمد تقی خاں بہادر قوی جنگ جس کو سرکار آصفجاہ ثانی کی میر سامانی کا اعزاز حاصل تھا اور بوجہ کارگزاری ترقی کر رہے تھے کہ بتاریخ ۴ ماہ جمادی الاخری سنہ ۱۲۱۳ھ ہجری مرض اسہال سے انتقال کیا۔

دوسرے فرزند حسن رضا خاں بہادر شوکت الدولہ نیر جنگ جو ابتدائً داروغگی باورچیخانہ بندگان عالی سے بعد ازاں نظامت بلدہ خجستہ بنیاد سے سرفراز ہوئے تھے بتاریخ ۲۸ ماہ شعبان سنہ ۱۲۱۶ھ مطابق سنہ ۱۸۰۱ء مرض اسہال وغیرہ سے رحلت کی۔

تیسرے فرزند علی زماں خاں المخاطب بہ حیدر یار خاں بہادر منیر الملک ثانی کا مفصلاً ذکر بحسب ضرورت سلسلہ دیوانی بعد کیفیت ارسطوجاہ بہادر و میر عالم بہادر

رضا یار خان بہادر حسام جنگ امین الدولہ امین الملک

۱۱۸۶ھ

۱۲۴۳ھ

کیا جائے گا۔ فرزند چہارم امین الملک امین الدولہ رضا یار خاں بہادر حسام جنگ تھے جو کہ پیشگاہ بندگان عالی سے بخدمت داروغگی فیلخانہ سرکار سلیمان جاہ بہادر خلف نواب آصف جاہ ثانی متعلق پائیگاہ ارسطو جاہ بہادر معمور تھے۔ عقب بادشاہی عاشور خانہ امین باغ جو مشہور ہے وہ انہیں کا تھا جو بسبب حوادث زمانہ سرکار عالی کے علاقہ میں ہو گیا ہے چنانچہ اوسی استحقاق سے چند علاقہ داران امین الملک مرحوم کو سرکار عالی سے اب تک ماہواریں ملتی ہیں۔ نیز حویلی موسوم بہ فتح محل جو قریب بادشاہی عاشور خانہ سر راہ واقع ہے جس میں مجلس مرافعہ قایم ہے یہ حویلی بھی امین الملک مرحوم ہی کی تھی۔ ان کے ایک فرزند حسن رضا خاں بہادر ذو الفقار جنگ بہادر حسن یار الدولہ دوسرے درگاہ قلیخاں بہادر عرف درگاہی صاحب ان کی ایک دختر شمس النسا بیگم صاحبہ تھیں جن کی شادی سرفراز جنگ بہادر سے ہوئی تھی ان کے بطن سے میر فدا علی خاں عرف سید صاحب موجود ہیں۔ تیسرے جہانگیر قلیخاں بہادر امین الدولہ تھے۔

امین الملک مرحوم کی دختر کی نسبت مختلف اقوال ہیں مولف تزک محبوبیہ ساکن مکان علاقہ نبین علی بیگ خان بخشی مرحوم اپنی تالیف مذکور میں لکھتے ہیں کہ بخشی موصوف کی شادی امین الملک موصوف کی نواسی جو دختر اعجاز الدولہ ابن رفعت الملک کے بطن سے تھی ہوئی یعنی نانی بڑی بیگم زوجہ بخشی موصوف امین الملک کی نواسی بطن سلطانی بیگم سے اور رفعت الملک کی پوتی تھیں۔

بعض وابستگان امین الملک کا بیان ہے کہ امین الملک

کیفیت مشیر الملک اعظم الامرا ارسطو جاہ بہادر

ارسطو جاہ بہادر کا نام تاریخی غلام سید تھا یعنی ۱۱۴۵ھ میں متولد ہوئے والد کا نام فرخ نژاد خاں تھا ان کے بزرگ سامانہ کے رہنے والے تھے سلسلہ نسب ان کا نوشیروان عادل تک پہنچتا ہے مجموعہ قصائد و تواریخ عہد ارسطو جاہ بہادر سے پیدا ہے کہ بہادر موصوف کو پیشگاہ آصفجاہ بہادر ثانی سے جاگیر ذات تعلقہ الگندل میں جب مرحمت ہوئی تو بہادر موصوف نے فی البدیہہ یہ مادۂ تاریخ انشا فرمایا وَاِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ ۱۱۷۹ھ۔ نیز محمد تقی خاں بہادر اکرام الملک برادر مشیر الملک بہادر ثانی کی تاریخ بلوغ بھی یہ خوب کہی ہے سالم بیت میں ؎

زامداد الٰہ بندہ و ایجاد ٭ بجوشید از سر فوارہ سیماب ۱۱۸۱ھ

ارسطو جاہ بہادر ۱۱۹۵ھ میں دیوان سلطنت ہوئے ۱۲۰۰ھ میں خطاب اعظم الامرا پایا۔ بوجہ سرکشی ٹیپو سلطان ۱۲۰۶ھ میں برائے گوشمالی لشکر گراں لے کر ہمراہی ولیعہد نواب سکندر جاہ بہادر جب گئے تو ٹیپو سلطان تاب مقابلہ نہ لا کر خواہان صلح ہوا نبا علیہ اس سے ملک و جواہر زر نقد و اسپ و فیل وغیرہ تحائف مالیتی بقدر دو کروڑ روپیہ بطور نذرانہ لے کر واپس آئے قطعہ تاریخ گذرانیدہ شیر محمد خاں ایمان یہ ہے ؎

بہ تسخیر ممالک شاہزادہ ٭ برآمد ہمچو خورشید جہاں گرد

کی دختر نانڈیڑی بیگم کے سوائے دوسری دختر الفت النسا بیگم بھی تھیں جن کی شادی
اعظم میرزا خاں ابن شہریار جنگ سے ہوئی۔
بعض قدما کا قول ہے کہ امین الملک مرحوم کو دختر ہی نہ تھی۔

فرزند ارسطو جاہ المخاطب سیف الدولہ المعروف بہ مالی میاں کا مجملاً ذکر بضمن کیفیت غیور جنگ اشجع الملک مرحوم کیا گیا ہے۔

منتہائے مراحم خسروانہ غفران مآب یہ کہ جب ایک پوتہ فرزند مذکور کے انتقال سے ارسطو جاہ بہادر کو سخت صدمہ ہوا تو خود بدولت غفران مآب نے برسم تعزیت مع شہزادگان رئیس الملک سلیمان جاہ بہادر و سیف الملک کیوان جاہ بہادر تشریف فرما ہو کر بہ کمال مرحمت ارسطو جاہ سے فرمایا کہ تمھارا ایک فرزند جاتا رہا ہے اس کے عوض دو فرزند تمھیں ہم دیتے ہیں اپنی فرزندی میں لو۔ اور اس طیب خاطر سے دیے کہ اپنے مذہب کے موافق تعلیم و تربیت کر لینے کا اختیار دیا چنانچہ ارسطو جاہ بہادر نے ویسا ہی کیا۔ سیف الملک بہادر کا دماغ بسبب لاحق ہونے عارضہ لقوہ و فالج کے صحیح نہ تھا اُن کے پوتے رحمن علی پادشاہ نواب سیف الملک بہادر رحال سے معلوم ہوا کہ ہر عشرہ محرم میں علموں کو نیزوں پر سے دن میں کئی بار اتار لیتے تھے پھر نصب کرتے تھے۔ ان کی زیست زیادہ نہ ہوئی بقول مولف دبدبہ نظام ۷ ماہ ربیع الآخر ۱۲۱۸ھ میں رحلت کی۔

رئیس الملک سلیمان جاہ بہادر سن طبعی کو پہونچ کر مرحوم ہوئے۔ عشرہ شریف میں علانیہ سیہ پوش و عزادار رہتے تھے اور با فیض و کرم تھے۔

مشیر آباد جو حسین ساگر کے قریب واقع ہے مشیر الملک ارسطو جاہ بہادر کا ۱۲۰۲ھ میں بنوایا ہوا ہے۔

سرور نگر کی کیفیت یہ ہے کہ ارسطو جاہ بہادر کی منکوحہ سرور افزا بیگم کو غفران مآب نے

بگفت ایمانؔ تاریخ مبارک ٭ سکندر جاہ فتح عالمی کرد ۱۲۰۶ھ

۱۲۰۹ھ میں منجانب غفراں مآب پونا جاکر ۱۲۱۱ھ میں بکمال دانائی وتدبر قلعہ دیوگیر دولت آباد اور ملک وزر چوتھ صوبہ بیدر کا مع جواہر گراں بہا وغیرہ لے کر حیدرآباد واپس آئے ہیں جس کے باعث غفرآن مآب نے نہایت عزت افزائی وقدردانی اعظم الامرا کی فرمائی ہے قطعۂ تاریخ واپسی از پونا گذرانیدہ سپہر یہ ہے ؎

چو اعظم الامرا باسعادت واقبال ٭ ز ملک مرہٹہ ایں شاد وکامراں آمد
سپہر گفت بتاریخ مقدمش مصراع ٭ مشیر ملک دکن صاحب قراں آمد ۱۲۱۱ھ

اس کے دوسرے سال یعنی ۱۲۱۲ھ میں خطاب ارسطوجاہ مرحمت ہوا۔ اس کی تاریخ منظومہ ارشد یہ ہے ؎

یافتہ چوں مشیر ملک خطاب ٭ تازہ از آصف زماں دل خواہ
گفت ارشدؔ برای تاریخش ٭ بازوی دولت است ارسطوجاہ ۱۲۱۲ھ

نوازشات نازبرداری غفراں مآب اور کامیابی وا ولوالعزمی ارسطوجاہ بہادر کا اندازہ اس کیفیت سے ناظرین کر سکتے ہیں کہ ایک صاحب کو باہر سے یعنی اپنے وطن سے طلب کرکے بعطائے جاگیرات ومنصب ونشان ونوبت وخطابات وغیرہ سرکار آصفیہ میں امیر اعظم بنادیا اور بمقابلہ نواب شمس الامرا بہادر خطاب نور الامرا بہادر دلوا کے کہا میں نے شمس میں سے نور نکالا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا ہے کہ نواب شمس الامرا بہادر بسبب خویشی خاندان آصفیہ ارسطوجاہ بہادر کی پروا نہیں کرتے تھے۔

بیرون بلدہ جانب شرق ایک گاؤں مرحمت فرمایا تھا۔ اس کو بیگم مزبورہ نے تعمیر حصار و برج سنگ بستہ وغیرہ آباد کر کے سرور نگر نام رکھا۔ اس کی تاریخ بنا منظومۂ صفدر علیخاں صفدر یہ ہے ؎

شد از برای سرور دل ارسطو جاہ ❊ عطاز حضرت جمجاہ آصف داور
بنام بیگم علیا قدر سرور افزا ❊ دہے کہ کامل آں باج خواہد از کشور
بحسن نیت او گشت ہمچو شہر صبا ❊ کہ بردہ خطۂ کشمیر رشک از اں یکسر
چوں سال بنا صفدر ز خرد گفتا (خواست) ❊ بود بہ امن واماں یارب ایں سرور نگر ۱۲۱۳ھ

تاریخ رحلت ارسطو جاہ مرحوم ۲۸ ماہ محرم ۱۲۱۹ھ ۔

سید ابوالقاسم میر عالم بہادر

۱۱۶۶ھ

۱۲۲۳ھ

مجملاً ذکر سید ابو القاسم المخاطب میر عالم بہادر

سید رضی ابن نور الدین موسوی[1] سادات جلیل القدر و علمائے شوستر سے عالم جوانی میں جب یہاں آئے تو غفران مآب نے ان کی نہایت قدر دانی فرمائی۔ جاگیر عطا کی۔ ہر شنبہ کو باریاب ہو کر بندگان خدا کے کام نکالتے تھے اور صاحب زہد و تقویٰ و بافیض و کرم تھے۔ ۲۴ جمادی الاول ۱۱۹۴ھ میں مرحوم ہوئے۔

نشات اعلیٰ ان کی منجانب سرکار نظام الملک بہادر سلطان روم و امرا وغیرہ کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر میں موجود ہیں۔ ان کے مہین فرزند سید ابو القاسم مخاطب میر عالم بہادر ۷ ماہ رمضان ۱۱۶۶ھ مطابق ۱۷۵۲ء میں یہاں متولد ہوئے۔ جس وقت جوان ہوئے ہیں تو ان کی لیاقت علمی و ذہانت طبعی ارسطوجاہ بہادر کے دل میں کھٹکنے لگی۔

---

[1] شجرۂ نواب میر عالم بہادر کہ در نسب سادات نوریہ

دربیان نسب علی سید نعمت اللہ جزایری بن السید عبداللہ[2] بن السید محمد[3] بن السید حسین[4] بن السید احمد[5] بن السید محمود[6] بن السید غیاث الدین بن السید مجد الدین بن السید نور الدین[9] بن السید سعد الدین[10] بن السید عیسیٰ[11] بن السید موسیٰ[12] بن السید عبداللہ[13] بن الامام ابی الحسن موسیٰ کاظم علیہ وعلیٰ آبائہ السلام۔ (سلسلہ صفحہ ۵۶ پر)

بعض تواریخ سے معلوم ہوا ہے کہ سرکار انگریزی کا وکیل مسٹر جانسن کا تقرر منجانب
لارڈ منویل بہادر گورنر جنرل کلکتہ ابتداء سنہ ۱۱۹۶ھ میں حیدرآباد دکن پر ہوا۔
قدما سے معلوم ہوا ہے کہ رزیڈنسی میں جو کوٹھی رزیڈنٹ بہادر کی سکونت کے لئے ہے
وہ حسب رائے میر عالم بہادر تعمیر ہوئی ہے
المختصر سنہ ۱۲۰۲ھ مطابق سنہ ۱۷۸۸ء میں مسٹر جانسن بہادر یہاں کے رزیڈنٹ تھے اس وقت
میر عالم بہادر درمیان وزیر نظام اور رزیڈنٹ بہادر کے وکیل قرار پائے تھے۔ مرہٹوں کی
سرکشی و غارتگری اور ٹیپو سلطان کی تمردی کے انسداد کے لئے یہ رائے قرار پائی کہ سرکار انگلشیہ
سے بناء دوستی و اتحاد تازہ و قائم کی جائے تاکہ وقت ضرورت ہمارے شریک حال رہیں۔
بنائے علیہ میر عالم بہادر نے سنہ ۱۲۰۴ھ م سنہ ۱۷۹۰ء میں سرکار نواب نظام علیخاں بہادر کی طرف سے
کلکتہ جاکر لارڈ کارنوالس سے تعلق اور دوستی کا عہد نامہ قائم کیا اور ٹیپو سلطان وغیرہ سے جنگ
کرنے میں دونوں قوتیں شریک رہنے کا بندوبست فرمایا۔

نسب نامہ سید[1] ابوالقاسم المخاطب بہ میر عالم مرحوم

بن سید[2] رضی بن سید[3] نورالدین بن سید[4] نعمت اللہ جزیرای بن سید[5] عبداللہ بن
سید[6] محمد بن سید[7] حسین بن سید[8] احمد بن سید[9] محمود بن سید[10] غیاث الدین
بن سید[11] مجدالدین بن سید[12] نورالدین بن سید[13] سعدالدین بن سید[14] علی بن سید[15] موسیٰ
بن سید[16] عبداللہ بن الامام ابی الحسن موسیٰ کاظم علیہ و علی آبائہ السلام۔

اپنے مصاحبوں سے کہتے تھے کہ یہ تو شستری بچہ بلائے بے درماں ہے دور ہی سے صرف میرے ہونٹوں کی حرکت پر میری باتوں کو سمجھ لیتا ہے۔ میرے بعد عجب نہیں کہ یہی دیوان ہو۔ یہی وجہ تھی جو ارسطو جاہ بہادر ہمیشہ بظاہر مہربان اور بباطن میر عالم بہادر کے درپے رہے۔

لہ سید نعمت اللہ جزائری چہار پسر داشتند

سید نور الدین	سید حبیب اللہ	سید محمد شفیع	سید جمال الدین
ہشت پسر مخلف شد	در صغر سن فوت کرد	از لاد ذکور مخلف نشد	یک پسر مخلف شد بنام سید مجد الدین بہ ہندوستان آمد از دو خبری نشد

۱ سید عبداللہ

۲ سید نعمت اللہ الشہیر بہ آغائی

۳ سید حسین

۴ سید محمد

۵ سید فرج اللہ

۶ سید مرتضی

۷ سید طالب

۸ سید رضی والد نواب میر عالم مرحوم

سید طالب کے فرزند محمد شفیع۔ محمد شفیع کے فرزند سید عبداللطیف خاں مصنف تحفۃ العالم برادر نواب میر عالم مرحوم

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵۷ پر ملاحظہ ہو۔)

رگوتم راؤ راجہ اندر کو پیشکاری سے موقوف کر کے بمنظوری اعلیٰ حضرت سکندر جاہ بہادر راجہ چندو لعل بہادر کو پیشکاری دلائی اور اپنا پیش دست بنایا قطعہ تاریخ وزارت میر عالم بہادر گزرانیدہ میر حسن علیخاں جولاں یہ ہے ؎

الٰہی در حضور میر عالم ٭ بود پیوستہ جشن عشرت اندوز
خرد فرمود تاریخ ہمایوں ٭ مبارک باد مہر بہجت افروز ۱۲۱۹ھ

بیرون بلدہ قصبۂ بدویل کے قریب ۱۲۲۲ھ میں بائیس۲۲ لاکھ روپے صرف کر کے تالاب بنوایا اور اس کی نہر بلدہ میں لائی جس کی تاریخ بناء اتمام کسی نے کہی ہے قطعہ

میر کہ عالم شدہ فرمان برش ٭ نہر رواں کرد بیاد حسینؑ
پیر خرد گفت بہ سال آں ٭ آب بخور سرد بیاد حسینؑ ۱۲۲۲ھ

ایضاً بابت اتمام ۔ میر عالم نمود کار ثواب ۔ اس تالاب کا سد و بند عجائب روزگار سے بطرز جدید یعنی فقط دیوار سنگ بستہ ہے اور اس میں جانب آب برج بشکل قوی بنائے گئے ہیں ۔

پختہ نہریں تعمیر ہونے کے بعد تاریخ نیک تالاب کا پانی بلدہ میں ابتداً جاری کیا گیا ہے تو اس روز ہرکارے متعین ہوئے تھے اور وہ دمبدم خبر دے رہے تھے کہ فلاں مقام تک پانی آ گیا فلاں محلے میں پہونچا تا آنکہ جب بلدہ میں پانی داخل ہونے کی خبر آئی تو میر عالم بہادر نے فی الفور سجدۂ شکر باری ادا کیا ۔

تالاب مذکور سے آب شیریں کی نہریں جو شہر میں آئیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک

وبدبہ نظام سے ظاہر ہے کہ لارڈ موصوف نے عہدۂ وکالت کو تابقائے سلطنت آصفیہ میر عالم بہادر کے خاندان میں قائم رہنے کا ذکر عہدنامے میں مندرج کرنا چاہا تھا مگر میر عالم بہادر نے براہ وفاداری کہا کہ مالک وآقا کا اختیار ہے جس سے چاہے کام لے وکالت وراثت ہو نہیں سکتی ۔

وقت روانگی کلکتہ میر عالم بہادر کی پانچہزار روپے ماہوار قرار پائی اور دو لاکھ روپے نقد مصارف سفر کے لئے عطا ہوئے ۔ اس سفر سے واپس آنے کے بعد اُسی سال خطاب میر عالم بہادر سے سرفراز ہوئے یہ خطاب بطرز ایران اپنے حسب خواہش لیا اور مدت العمر اسی پر قانع رہے کسی اور خطاب جنگی ودولائی وغیرہ کی خواہش نہ کی ۔

۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء میں پھر ٹیپو سلطان کی عہدشکنی وتمرد کی وجہ سے میر عالم بہادر سرگروہ فوج نظام ہو کر گئے اور باشتراک فوج انگریزی سرنگ پٹن فتح کرکے جب واپس آئے ہیں تو نواب نظام علیخاں بہادر نے اپنا خاص ہاتھی میر عالم بہادر کے واسطہ روانہ فرمایا اور تین کوس تک استقبال کو جانے کے لئے امرائے سلطنت کو حکم دیا ۔ اور بکمال عزت وشوکت شہر میں لائے گئے ۔ اس فتح سرنگ پٹن کے جلدو میں جو روپیہ انعام ملا تھا اس سے میر عالم بہادر نے مچھلی بندر پونا اورنگ آباد وغیرہ کے راستوں پر مسافروں کے واسطے ہر مقام پر سرا باولی مسجد نہایت پختہ تعمیر کرادی جن کی مسافروں کے لئے سخت ضرورت تھی اور اب تک موجود ہیں ۔

بموجب تاریخ رشید الدین خانی وغیرہ ۱۲۱۹ھ میں جب میر عالم بہادر دیوان ہوئے تو

قریب حویلی نواب صمصام الملک بہادر سرِراہ واقع تھا جس کو ۱۲۱۹ھ میں بنوایا تھا
چنانچہ شیر محمد خاں ایمان کا یہ **قطعہ** تاریخ تعمیر حوض مذکور ہے ؎

شرف بخش وزارت میر عالم ✧ بنا فرمود ایں فرخندہ درگاہ
الٰہی در جہاں ایں فیض جاری ✧ بماند موجزن شام و سحر گاہ
حضور آستان شاہ مرداں ✧ چو وضع حوض عالی شد سرِ راہ
خرد فرمود تاریخ بنائش ✧ ببیں کوثر لگام پنجۂ شاہ ۱۲۱۹ھ

یہ حوض بعہد میر عالم مرحوم تالاب مذکور کی نہر سے پر آب رہتا تھا گویا سبیل تھی
جس سے عام مخلوق سیراب و فیض یاب ہوتی تھی۔

قدیم بزرگوں سے سنا گیا ہے کہ تالاب مذکور کا پانی جو بلدہ میں آیا تو اس پانی سے
پہلے پہل **فی سبیل اللہ** یہی حوض بھرا گیا تھا اور اس روز درگاہ موصوف میں بحکم میر عالم بہادر
کئی پلہ شکر شکریہ کامیابی عام مخلوق کو تقسیم ہوئی تھی۔

اس حوض کو بسبب صغیر سنی نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہٗ بوجہ ناپرسانی
سیدھی عنبر خانساماں نے ۱۲۱۶ھ میں منہدم کر کے اس کے حاشیہ وغیرہ کے پتھر ولی سے
جو کہ نہایت مصفا تھے مسجد منصور خاں کے لئے جو اسی محلے میں واقع ہے حوض بنوا دیا۔
حالانکہ کسی کی وقف کردہ و یادگار تعمیر کو ایسا نابود کر دینا جائز نہ تھا۔

خانساماں مذکور کی ایک اور کاروائی اسی قسم کی جو خالی از دلچسپی نہیں ہے —
بیں ضمیمہ بیان کرنے میں آئے گی۔

جسم ناتواں کی رگوں میں گویا خون تازہ دوڑ گیا ہے۔ جان آ گئی ہے۔ خصوصاً بفیض
دریادلی و مراحم رعایا پروری غفران مکان ۱۳۱۱ھ میں بصرف زرکثیر آہنی نلیں بلدہ
میں جہاں تک پانی کی رسائی ممکن تھی بچھ گئیں ہیں۔ شاہروں پر جابجا برائے فیض عام
ٹوٹیاں نصب ہوگئیں۔ اعلیٰ و ادنیٰ جس نے درخواست مع خرچ داخل کی اس کے
مکان میں پانی کا نل آگیا۔ نل کیسا بلکہ کہنا چاہئے کہ تالاب میر عالم مرحوم اس کو ملا ہے۔
جس قدر پانی جس وقت چاہو لے لو۔ چھنا ہوا نفیس پانی مخلوق کو بآرام میسر ہو رہا ہے۔
جو پانی انسانوں کو نصیب نہ تھا اب اس سے جانور چوپائے تک سیراب ہو رہے
ہیں۔ ورنہ قبل تعمیر تالاب مذکور محلات شاہی کے حوض موٹکشی کے ذریعہ کھاری پانی سے
بھرے جاتے تھے۔ علیٰ ہذالقیاس وزرائے امرائے عظام کے ہاں بھی باولیوں ہی سے
اجرائے کار ہوتا تھا۔ آب خاصہ شاہی اور چند امرائے عظام کے لئے چشمۂ واقع
بیرون بلدہ سے جس کا ذکر حالات رکن الدولہ مرحوم میں کیا گیا ہے میٹھا پانی آتا تھا۔
باقی جملہ بندگان خدا اعلیٰ و ادنیٰ باولیوں کا پانی پیتے تھے۔ کسی باولی یا کنویں کا پانی زیادہ
شور نہ ہوتا اور کسی قدر گوارا ہوتا تھا تو وہ میٹھے پانی کی باولی کہلاتی تھی۔ اس کو غنیمت
جان کر دور دور سے لوگ آکر پانی لیجاتے تھے۔ ساکنان قریب رود موسیٰ ندی کے
چشموں کا پانی پیا کرتے تھے جس کے باعث صحت درست نہیں رہتی تھی۔

المختصر میر عالم مرحوم کی یادگار یہ تالاب بلدہ کی جان ہے۔ منجملہ یادگار و آثار
میر عالم مرحوم درگاہ پنجۂ شاہ ولایت مع حوض ہشت پہل وغیرہ جو روبروئے درگاہ موصوف

وحکومت کے عالم میں بصد شوق اپنی بنوائی ہوئی عمارت کو بجائے تہنیت و دعائے بقا۔ ناپایدار اور گذاشتنی کہنا بلکہ کندہ کرادینا دال ہے میر عالم مرحوم کے بیدار دل و با خدا ہونے پر۔

نیز مسجد جلو خانہ جو فی الحال میر عالم کی منڈی کہلاتی ہے ۱۲۱۸ھ میں تعمیر ہوئی جلوخانۂ مذکور کی اتمام تعمیر ۱۲۲۰ھ میں ہوئی۔ اسی زمانے میں آبادی کربلای معلی کا اور نجف اشرف کا حصار خشت و گچ سے بنوایا کیونکہ وہاں پتھر نہیں ہے۔ پرانی عیدگاہ بہت فاصلے پر ہونے سے مخلوق خدا مسلمانان مقیم بلدہ کو نماز عیدین کے لئے زحمت ہوتی تھی اس لئے قریب بلدہ اپنے تالاب کے پاس نئی عیدگاہ ۱۲۲۱ھ میں تعمیر کی۔

اس زمانے کے بعض بدگمانان بے خبر کا یہ خیال ہے کہ میر عالم مرحوم اس قدر املاک وعمارات و تالاب وغیرہ بغیر ناجائز آمدنی کے کیونکر بنائے ہوں گے۔ مگر افسوس ہے ایسے خیال کرنے والوں سے کہ پہلے یہ نہیں دریافت کرتے کہ میر عالم مرحوم کی آمدنی کیا تھی۔ موازنہ مذکور بابتہ ۱۲۰۸ف میں ہر ایک وزیر زمانہ سابق کی تحریر دیوانی بتلائی گئی ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ فی روپیہ تین آنے کے حساب سے جس کا تخمینہ بائیس لاکھ روپے سالانہ ہوتا ہے میر عالم بہادر کو فقط تحریر دیوانی ملتی تھی۔ اس کے سوائے جاگیریں تھیں۔ اور فتح سرنگ پٹن کے صلہ میں زرکثیر خزانہ شاہی سے عطا ہوا تھا۔ نیز مصارف سفر کلکتہ وغیرہ کے لئے لاکھوں روپے عطا ہوئے ہیں۔ پس بمقابل آمدنی مذکورہ یہ املاک کچھ ایسی زیادہ تو نہیں ہیں۔ اور املاک بھی اکثر باقیات الصّالحات و باعث آرام مخلوقات مساجد سرا چاہ مسافروں کے واسطے اہل شہر کے لئے مساجد عیدگاہ خصوصاً تالاب تو ایسا بنوایا ہے

بعہد میر عالم بہادر مرحوم ۱۲۲۰ھ میں **باغ بارہ دری** بھی لب رود موسیٰ تیار ہوئے
علاوہ کئی مکانات تیار کرنے کے ایک قصر عالیشان موسوم بہ **گلزار محل** بطرز ایرانی بنوایا
اس باغ کی تاریخ ایمانؔ نے خوب کہی ہے اور وہ یہ ہے ؎

ہر قصر ز حسن رشک ایوان بہشت ٭ ہر نہر رواں ز آب خوش جان بہشت
آراستہ شد چو باغ میر عالم ٭ رضوان تاریخ گفت بستان بہشت

قصر مذکور کو لکڑ کوٹ بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں زیادہ تر چوبینہ صرف ہوا ہے ۔اس کے
نیچے کے درجے میں جو بیچ کی رواق کلاں ہے اس کی پیشانی کے تختے چوبین پر جو کندہ ہے
نقل اس کی یہ ہے ۔ یا اللہ یا حفیظ یا قہار بسم اللہ خیر الاسما
ذات التی من منزلا مبارکا و انت خیر المنزلین والحمد للہ
رب العالمین ؎

متوصد ز کاخ و صفّہ و ایوان نگاشتن یا اللہ کاشانہ ہای سر بفلک بر فراشتن
گلہائے رنگ رنگ درختان میوہ دار الحفیظ در باغ و بوستان ز سر شوق کاشتن
دانی کہ چیست تا بمراد دل اندر آں یا قہار یک لحظہ دوستی بتواں شاد و داشتن
ورنہ چگونہ مردم عاقل بنا کنند ٭ از گل عمارتی کہ بباید گذاشتن
سنہ فی یکہزار دو صد بست و سہ ہجری نبوی ۔ بتعلیم نادر قلم خاں عمل امام یزدی
کتبہ محمد باقر خاں نادر قلم

سبحان اللہ بنائے باغ و عمارت کی وجہ کیا پاکیزہ بتلائی ہے ۔ اور کمال ثروت

میر عالم مرحوم کے ایک بھائی سید زین العابدین تھے جن کی اولاد صاحب جاگیر ایرانی گلی
میں سکونت پذیر ہے۔

میر عالم بہادر بتاریخ ۲۳ ماہ شوال ۱۲۲۳ھ دنیائے فانی سے عازم بہشت بریں ہوئے۔
انہیں حسب وصیت درگاہ پنجہ شاہ میں دفن کرنے والے تھے لیکن نواب سکندر جاہ بہادر نے
ارشاد فرمایا کہ میر صاحب کو میر صاحب کے پاس رکھنا مناسب ہے یعنی دائرہ میر مومن صاحب
قدس سرہٗ میں لہٰذا دائرۂ مذکور میں ان کا دفن ہوا۔ میر عالم مرحوم نے درگاہ موصوف میں جو قبر اپنے لئے
بنوا رکھی تھی وہ قبر خالی ہنوز باقی ہے۔

میر عالم مرحوم صاحب علم و فضل تھے۔ نظم و نثر میں کمال مہارت و طبع رنگیں رکھتے تھے
باوجود کثرتِ اشغالِ خدمت و مہماتِ دولت امورِ اخروی سے غافل نہ تھے۔ منجملہ تصنیفات
و تالیفاتِ مرحوم موصوف جو کتابخانہ نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہٗ میں موجود ہیں یہ ہیں۔
مصباح العارفین در طریقۂ نماز تہجد وغیرہ عبادات۔ رسالۂ ترکیبِ زیارت عاشورہ وغیرہ
دہ مجالس عزائے سید الشہدا علیہ السلام۔ حدیقۃ العالم تاریخ مشہور و مطبوعہ ۱۲ھ
اس کو بستانِ آصفیہ میں مولفہٗ سید عبد اللطیف خاں بتلایا ہے حالانکہ مولفہٗ خان موصوف یہ نہیں ہے
بلکہ تحفۃ العالم ہے جو کہ ۱۲ھ میں طبع ہوئی ہے۔ مثنوی جس کے چند شعر بغرض ملاحظہ لطف طبع
ناظم ہدیۂ ناظرین یہ ہیں ؎

ای مہر سپہر آشنائے ✽ سرتا پائے تو دلربائے
ای مردم دیدۂ محبت ✽ سرتا قدمت طلسم الفت

کہ تمام بلدہ کی جان ہے۔ ایسے سید جلیل القدر و بزرگ با فیض مرحوم کی نسبت بدگمانی و بہتان گناہ عظیم ہے۔

اندرون دروازہ چادر گھاٹ ایک باغ زیب النساء بیگم کا کہلاتا تھا جس میں دومنزلہ بارہ دری عالیشان تقریباً چالیس برس کے قبل تک بھی خستہ حالت میں باقی تھی اس کے روبرو ایک حوض بہت بڑا تھا جس میں تالاب میر عالم مرحوم سے نہر آئی ہوئی تھی۔ نیز باغ میں ایک باولی کئی موٹ کی تھی اور چھوٹے حوض کیاریاں پختہ نیز آثار دیگر امکنہ وغیرہ تھے اس باغ کی دیوار جانب شرق فصیل شہر پناہ تھی۔ جانب غرب اس کا بہت بڑا مستحکم دروازہ سر راہ واقع تھا کہ ہاتھی مع عماری جس میں سے جا سکتا تھا۔ فی الحال اسی مقام پر بنڈی خانہ علاقہ صرفخاص مبارک تیار ہوا ہے۔ بیگم موصوف مرحومہ زوجہ میر عالم مرحوم کی تھیں معلوم نہیں کہ وہ باغ کس وجہ سے سرکار عالی کے علاقہ میں ہو گیا۔ اب اس باغ کی زمین پر ایک محلہ آباد ہوا ہے موسوم بہ عثمان پورہ۔

میر عالم مرحوم کی دو دختریں ایک بطن سے تھیں جن کا ذکر احوال منیر الملک بہادر ثانی میں کیا جائے گا۔

تیسری دختر خیر النسا بیگم صاحبہ تھیں جن کی شادی محمد نقی خاں سے ہوئی جو کہ پردادا میر امام علیخاں عرف حاجی صاحب مرحوم کے تھے۔ اور ایک فرزند سید رضی نام ۱۱۹۹ھ میں متولد اور ۱۲۱۵ھ میں مخاطب بہ میر دوران ہوئے ان کی شادی نور جہاں آرا بیگم بنت بہرام الملک ثانی سے ہوئی تھی۔ انتقال پر ملال ان کا در عین شباب بلکہ در آغاز شباب ماہ رجب ۱۲۱۶ھ میں ہوا۔

دو کلمہ صیغۂ نکاح میں کیا اثر ہوئے گا کہ اس کے پڑھنے سے مرد کے لئے عورت حلال ہو جاتی ہے ورنہ حرام ۔ یہ سن کر میر عالم مرحوم نے ای زنجلب (بھڑوے) کہا اور ساتھ ہی کھڑے ہو کر مشغول نماز ہو گئے ۔ اس خطاب سے ملّا طاہر کا رنگ رو متغیر ہو گیا اور پیچ و تاب کھانے لگا تا آنکہ میر عالم مرحوم نماز سے فارغ ہوئے اور اس کو برہم دیکھ کر فرمایا اے ملّا دیکھا تم نے کلمہ میں کیا اثر ہوتا ہے اب تو نہ کہو گے کہ دو کلمہ عقد نکاح میں کیا اثر ہو گا ۔

شکل تو بہ کلکِ دل مصوّر ٭ جسم تو بآب جان مخمّر
از شوق تو شد جہاں جہاں شور ٭ از رگ رگ من عیاں چو طنبور
شور تو عیاں نہ برز بانم ٭ سوزِ تو نہاں بمغزِ جانم
تاروی ترا بمن نمودند ٭ درہائے بلا بمن کشودند

نخشات بنام ارسطوجاہ بہادر وغیرہ موسوم بہ **باغ بہار** اسم تاریخی جن میں ایک رقعہ مختصر یہ ہے۔ **بنام اعلیحضرت آصفجاہ ثانی در شکر عنایاتِ خربوزہ توام**[11][12]

در موقوف ادائی آداب دوگانہ شکر نعمت والا و مرحمت دوبالا یعنی زوج خربوزہ توام کہ از پیشگاہ فضل وکرم بنجابت آنہم آغوش افتخار و انبیاز دوش بدوش مکرمت و اعزاز گردیدہ و شجرہ قامت عبودیت استقامت را بہ ثمرہ قواعد کورنش وتسلیم راکع وساجد ساختہ میوۂ مزبور مضاعف رسم معہود از نظر عالم پرور میگذراند لیکن چوں اینقدر قسم اوّل یک دفعہ بہم نمیرسد بدفعات بمعرض عرض خواہد رسانید تا مزرعہ اخضر فلک بہ اثمار کواکب مثمر و بارور است حدیقہ عمر و اقبال خدیو بیہمال از آبیاری لطف حضرت باری تازہ و ریان و بسرسبزی خلود و دوام تواماں باد برب العباد۔

ان کا ایک اور مجموعۂ انشا موسوم بہ انشاء عالم تھا جس کا ذکر مرقعہ عبرت میں ہے۔

میر عالم مرحوم کی قابلیت معقول ومنقول کا اندازہ اس واقعہ سے ناظرین فرما سکتے ہیں کہ ایک روز ملا طاہر دہریہ مذہب ایرانی خدمت میر عالم مرحوم میں حاضر ہوا تھا۔ اثنائے تقریر میں عقد نکاح کا ذکر آگیا تو کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ

تتمہ احوال علی زمانخاں المخاطب حیدر یار خاں بہادر نیر الدولہ نیر الملک ثانی امیر الامرا

واضح ہو کہ تیسرے فرزند محمد صفدر خاں بہادر غیور جنگ مرحوم کے نیر الملک ثانی
موصوف جدِّ امجد نواب صاحب مغفور کے جو بسبب قابلیت و اقبالمندی ارشد اولاد
تھے بعد وفاتِ والد پیشگاہ غفران مآب میر نظام علی خاں بہادر سے بخطاب حیدر یار خاں
بہادر غیور جنگ نیر الدولہ نیر الملک و منصب پنجہزاری سہ ہزار سوار علم و نقارہ و پالکی جھالردار
سے سرفراز ہوئے۔ نیز از روے سیاہہ دفتر تاریخ رشید الدین خاں وغیرہ ثابت ہے کہ
۱۲۰۶ھ میں خطاب امیر الامرا سے بھی ممتاز ہوئے تھے۔ جب کہ ارسطو جاہ بہادر پونا
گئے تھے اون کے متعلق جملہ کاموں یعنی نظم و نسق ابواب خاص حضوری و بندوبست
فوج سرکاری کو نواب غفران مآب نے بہ کمال عنایات و اعتماد نیر الملک بہادر ممدوح کے
اختیار میں دے دیا تھا۔

میر عالم بہادر مرحوم نے حدیقۃ العالم میں تحریر فرمایا ہے کہ جیسا کہ حضرت
رسول الثقلین ابو القاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دختر خاتون جنت بحکم الٰہی حیدر صفدر
سے منسوب ہوئیں اسی طرح نورِ چشمی مجد ابو القاسم کی جو ذریت رسول اکرم سے ہے اس
حیدر ابن صفدر سے یعنی حیدر یار خاں نیر الملک ابن محمد صفدر خاں اشجع الملک سے

علی زمان خان بہادر غیور جنگ منیر الدولہ منیر الملک امیر الامرا

۱۱۸۴ھ — ۱۲۴۸ھ

بامر تقدیر الٰہی و حکم بندگان عالی حین حیات والد نامزد ہوئی۔ بعد والد یعنی بعد رحلت اشجع الملک مرحوم بندگان عالی نواب آصفجاہ ثانی نے بہ کمال مراحم خسروانہ نواب نیر الملک بہادر کو اپنے دولت خانہ میں طلب فرماکر مکان گلشن محل شادی کے لیے عنایت فرمایا۔ رسوم ابتدائی مانند رنگپاشی وغیرہ لوازم شادی کو بھی بتوجہ خاص بہ کمال بشاشت ادا فرمائے ستر ماہ ربیع الاولی سے یعنی تاریخ آغاز شادی سے مع محلات مبارک بالباس رنگین روزانہ دو مرتبہ تا ختم شادی رونق افزائے بزم شادی ہوتے رہے۔ اور جملہ مصارف شادی خزانہ شاہی سے مرحمت فرمائے۔ بتاریخ چاردہم ماہ ربیع الاخری ۱۲۱۴ھ جو کہ جلوہ کا روز تھا ہار۔ سرپیچ مع جیغہ۔ کلگی۔ طرہ۔ دستبند مرصع یہ سب اپنے دست مبارک سے نوشہ کے سر و بازو پر باندھے۔ عروس کو بھی بعطائے زیورہ جواہر گراں بہا زینت بخشی نیز نوشہ کی والدہ کو جواہر بیش قیمت مرحمت فرمایا۔

واضح ہو کہ اس شادی کے قبل نیر الملک بہادر موصوف کے ایک اکبر اولاد تھی۔ یعنی محمد صفدر خاں بہادر ذوالفقار جنگ اکرام الدولہ اکرام الملک۔ ان کی شادی بنت حسن یار جنگ حسن یار الدولہ ابن امین الملک مرحوم مسماۃ مبارک بیگم صاحبہ سے ہوئی۔ جن کا انتقال ہشتم ذیقعدہ ۱۳۰۱ھ کو ہوا۔ اس مرحومہ کے بطن سے اکرام الملک مرحوم کو ایک فرزند تھا اور ایک دختر تھی۔ فرزند کا نام از روئے بیاہہ دفتر لالہ بہادر میر بہرام علیخاں بہادر غیور جنگ تھا جو ہمراہ پدر عربوں کے ساتھ مقتول ہوا۔ ان کی یعنی میر بہرام علی خاں کی ایک دختر نظام النسا بیگم صاحبہ تھیں جن کی شادی میر حیدر علیخاں

کا عقد بتاریخ گیارہ ماہ ربیع الآخر ۱۳۱۱ھ نواب خانخاناں بہادر ممدوح سے ہوا۔ دختر کلاں منور بیگم ناکتخدا ہنوز موجود دختر سومی خورد مسماۃ کا انتقال میں ہوا

دوسرے فرزند سید عبداللہ خاں بہادر کے میر ولایت علی خاں بہادر فوجی جنگ ان کی دختر مسماۃ ریاض النسا بیگم زوجہ میر موسی رضا خاں مرحوم ابن سید عاقل خاں مرحوم نبیرہ بہرام الملک مرحوم۔

تیسرے فرزند میر محمد سلیمان خاں بہادر۔ ان کی ایک دختر مسماۃ دلارا بیگم زوجہ میر عنایت علی ابن میر پرورش علی جاگیردار داروغہ پادشاہی عاشور خانہ وغیرہ جس کا انتقال پہلی زچگی کے چھ روز بعد ہوگیا اور مولود بھی نہ رہا۔

چوتھے فرزند میر محمد کاظم علیخاں لاولد فوت ہوئے۔

دختر سید عبداللہ خاں موصوف کی ایک مسماۃ امیر النسا بیگم صاحبہ جن کی شادی سزاوار جنگ بہادر ابن مختار الدولہ بہادر سے ہوئی۔ ان کے بطن سے میر یاور علیخاں بہادر شہاب جنگ افتخار الملک حال پیدا ہوئے۔

دوسری دختر کریم النسا بیگم صاحبہ ان کی شادی مرزا شمشیر علیخاں ابن مرزا محمد علیخاں مستقیم الدولہ ثانی سے ہوئی۔ بعد زچگی کے ان کا بھی انتقال مع مولود ہوگیا۔

میر عالم بہادر نے اپنی پہلی دختر نفیسہ بیگم صاحبہ فوت ہونے کے بعد دوسری دختر عفیفہ مسماۃ صاحبہ بیگم صاحبہ ہمشیرہ حقیقی نفیسہ بیگم مرحومہ کو باجازت و ایمائے اعلیحضرت مغفرت منزل ۱۲۱۹ھ میں منیر الملک بہادر موصوف سے شادی کردی۔

ابن میر مہدی حسن خاں مرحوم ابن داور جنگ مرحوم سے ہوئی۔ بطن نظام النسا بیگم صاحبہ
سے تین فرزند ہیں ایک تراب جنگ بہادر دوسرے حسن یار جنگ بہادر تیسرے حیدر یار جنگ
بہادر۔ اور ایک دختر شہر بانو بیگم صاحبہ تھیں جن کی رحلت ہوگئی ہے۔

اکرام الملک مرحوم کی دختر کا نام سلطانی بیگم صاحبہ تھا اور وہ نیر جنگ اشجع الدولہ
مرحوم سے جن کا ذکر آئندہ آئیگا بیاہی گئیں۔

الحاصل شادی کے بعد دختر میر عالم مرحوم مسماۃ **نقیبہ بیگم صاحبہ** کے بطن سے
بتاریخ بست و ہشتم محرم ۱۲۱۵ھ نیر الملک بہادر کو فرزند خدا نے دیا مگر بعد دو ساعت صاحبہ
موصوفہ نے انتقال کیا۔ اس واقعہ کے بعد اعلیحضرت نے بہ کمال نوازش ارسطو جاہ بہادر
کو میر عالم بہادر کے پاس برسم تعزیت روانہ فرمایا اور یہ ارشاد ہوا کہ اس مولود کا
نام سید عبداللہ خاں بہادر رکھا جائے۔ یہ عبداللہ خاں بہادر موصوف المخاطب
بہ قوی جنگ اشجع الدولہ کے چار فرزند تھے اور دو دختر۔ ایک فرزند میر جواد علی
نیر جنگ اشجع الدولہ بہادر جو کہ عہد دیوانی نواب صاحب مغفور میں افسر اعلیٰ جمعیت نظم
سرکار عالی کے ہوئے تھے۔ جن کی رحلت انیس ۱۹ ماہ شعبان ۱۳۰۹ھ میں ہوئی۔ ان کا
ایک فرزند محمد علی خاں بہادر ذوالفقار جنگ تھا جو روبروے پدر ۱۳۰۸ھ میں مرحوم
ہوا۔ اور ایک دختر مسماۃ دیدار النسا بیگم صاحبہ تھیں جن کی شادی نواب نظام یار جنگ
بہادر خانخاناں بہادر سے ۱۳۰۸ھ میں ہوئی۔ بعد رحلت دیدار النسا بیگم صاحبہ
جو ۱۳۱۰ھ میں واقع ہوئی دختر متوسط ذوالفقار جنگ موصوف خیر النسا بیگم صاحبہ

قطعہ تہنیت و تاریخ منظومہ میر جولان یہ ہے ؂

زہی شادی کہ از جوش مسرت	جہاں یکسر چو گلشن یافت تزئین
برونق بزم چنداں منعقد شد	کہ حسرت می نماید عقد پروین
بپردار دہمہ اوقات ہریک	قبائے مثل گل خوشبو و رنگین
برای آسماں قوس قزح شد	حمایل آنقدر ہا ساخت گلچین
چنیں جشن طرب افزا ندیدند	بعہد خوشتن پرویز و شیریں
بخلقت آنقدر شد بذل انعام	زبان بکشاد یک عالم بہ تحسین
چو شد مہر و منیر و ماہ باہم	زمانہ یافت از آشوب تسکین
دعا کردیم جولاں بہر دولت	ملایک بر فلک گفتند آمین
خرد فرمود تاریخ مبارک	قرآن نیرین عزت آمین ۱۲۱۹ھ

اس بی بی کے بطن سے دو فرزند ۔

ایک والد نواب صاحب مغفور کے **میر محمد علی خاں** بہادر سالار جنگ شجاع الدولہ ۱۲۲۲ھ میں متولد ہوئے ۔ ان کا **قطعہ تاریخ** میلاد منظومہ سید میرزا غالب یہ ہے ؂

چوں بنواب ما منیر الملک	داد ایزد پسر بوجہ احسن
سال میلاد او چو پرسیدم	عقل گفتا ستارۂ روشن

ان کی رحلت عین شباب میں یعنی ۲۵ پچیس برس کے سن میں ۱۲۴۷ھ میں ہوگئی ۔

محمد علی خان بہادر سالار جنگ شجاع الدولہ

۱۲۲۲ء ۱۲۴۷ھ

ان کی مہر کا سجعہ یہ تھا ۔ بود جانشین محمد علی [۱۲۳۷]
دوسرے فرزند میر عالم علیخاں بہادر سراج الملک نواب صاحب مغفور کے ۱۲۲۴ھ میں متولد ہوئے ۔ ان کے تولد کا مادہ تاریخ طبعزاد بابو رائے یہ ہے ۔
خورشید جہاں آمد ۔ ان کا سجعۂ مہر یہ تھا ۔ بود یاور سر دو عالم علی [۱۲۳۷]
ان کا باقی احوال بسلسلۂ وزرا آیندہ برمحل بیان کیا جائے گا ۔ فی الحال کیفیت منیر الملک بہادر ثانی کی تکمیل لازم ہے کہ بعد رحلت میر عالم بہادر ماہ شوال ۱۲۲۳ھ میں نواب منیر الملک بہادر موصوف دیوان سلطنت ہوئے ۔ مادہ تاریخ من اوصاف منیر طبعزاد نور علی یہ ہے ۔ منیر الملک شد وزیر دکن سلمہ اللہ ۔ بہادر موصوف نے اپنے عہد وزارت میں حتی الامکان انتظام سلطنت میں کوششیں کیں ۔ عدالت کا انتظام جو سلطنت کے لیے واجبات سے ہے فرما رہے تھے چنانچہ ایک عدالت موسوم بعدالت بزرگ قایم کی گئی تھی ۔ جس کے ناظم مولوی شرف الدین وغیرہ ہوئے تھے ۔ اسی طرح اور امور سلطنت وغیرہ کی اصلاح کا خیال تھا ۔ مگر بہادر موصوف خاطر خواہ کیا کر سکتے تھے کہ برائے نام وزیر تھے نہ دفتر دیوانی نہ خزانہ عامرہ نہ کوئی اختیار حاصل تھا ۔ عطائے جاگیرات و انعام وغیرہ جملہ مداخل و مخارج ریاست کے متعلق خاص اعلیحضرت کے احکام جاری ہوتے تھے ۔ وثایق واسناد خوشحال چند اہل دفتر کے پاس داخل ہوتے تھے ۔ مدار المہام وقت کو کوئی پوچھتا نہ تھا ۔ مہاراجہ بہادر نو شیکار و مرجع ریاست ہی تھے ان کا ذکر کیا ہے بلکہ خوشحال چند و لالہ بہادر کے دیوانخانہ میں روزانہ دربار رہتا تھا ۔ جاگیردار و تعلقدار

حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ خود منیر الملک ثانی کی شادی دختر میر عالم مرحوم سے ہوئی ہے اور ان کے فرزندوں میں کسی کو منیر الملک خطاب نہیں ہوا ہے غالباً ترجمہ کرنے میں یا کتاب مرقعہ عبرت میں یہ غلطی واقع ہوگئی ہے۔

وانعامدار و منصبدار وغیرہ حاضر رہتے تھے۔ دنیا کا دستور بھی یہی ہے کہ جس سے کام نکلتا ہے اور جس کے قبضۂ قدرت میں اپنے مقاصد انسان پاتا ہے اسی کی طرف دوڑتا ہے ؎

ہر کجا چشمۂ بود شیریں   مردم و مرغ و مور گرد آیند

الغرض منیر الملک بہادر برائے نام مدار المہام رہ کر جملہ کار و بار دیوانی بمقتضائے مصلحت وقت اپنے پیشکار مہاراجہ چندو لال بہادر کے ذمے کر دیے تھے کیونکہ بقول مولف رشید الدین خانی و مسٹر کرپل مولف امانی علاقہ برار۔ مہاراجہ بہادر پیشکار بھی اور رزیڈنٹ بہادر عہد کے سازگار بھی تھے اور میر عالم بہادر مرحوم کے دستگرفتہ و ہوشیار بھی تھے پیشکاری و دیوانی ہر دو خدمات کو ہوشیاری وہمت سے انجام دیا۔ نذرانہ و پیشگیات سے کام لیا۔ جس کو چاہا جاگیریں عطا کیں جس کو چاہا اس سے لے لیں۔ نزدیک و دور سخاوت میں مشہور ایسے ہوئے کہ اہل بنارس وغیرہ اس حیدرآباد کو چندو لعل کا شہر کہنے لگے تھے۔

المختصر منیر الملک بہادر ثانی ۱۲۲۴ھ میں منول ہوئے اور پچیس سال وزیر سلطنت رہ کر ۱۲۴۸ھ میں مرحوم ہوئے۔

مرقعہ عبرت میں مرقوم ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے کو یہی خطابات دیے گئے اور وہ منیر الملک ثالث ہوئے اور ان کی شادی میر عالم مرحوم کی صاحبزادی سے ہوئی۔

جن میں مولف کے والد مرحوم بھی شریک تھے۔ مہاراجہ بہادر کو مذاقِ سخن بدرجہ کمال تھا۔ اہلِ سخن کی نہایت قدر فرماتے تھے اور خود بھی زبان فارسی اور اردو میں عمدہ شعر کہتے تھے۔ **شاداں** تخلص تھا۔ چنانچہ دیوان ان کے فارسی اور اردو ہر دو کتابخانۂ سرکار نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہٗ میں موجود ہیں۔

المختصر تخمیناً گیارہ سال بالاستقلال مدارالمہام و مرجعِ خاص و عام رہ کر ۱۲۵۹ھ میں مدارالمہامی کا استعفا دیدیا۔

بستان آصفیہ میں مرقوم ہے کہ جب منیر الملک مدارالمہام کا انتقال ہوا تو امورات دیوانی معطل رہے لیکن اپنے بڑھے ہوئے رسوخ کے باعث راجہ صاحب تمام ملکی و مالی انتظامات کرتے رہے آپ کی فیاضی و خیرات کا یہ انجام ہوا کہ ملک کے مخارج مداخل سے زیادہ ہو گئے۔ افواج اور اعزائے حضور پر نور کی تنخواہیں چڑھ گئیں اور لوگوں کو تکلیف ہونے لگی اور آخر کار حضور نظام نے فریزر رزیڈنٹ بہادر کے مشورہ سے بتاریخ ۱۱ شعبان ۱۲۵۹ھ مہاراجہ کو معزول کر کے تیس ۳۰ ہزار روپے ماہانہ مقرر فرمایا۔

مہاراجہ ۱۲۶۱ھ میں فوت ہوئے ان کے عہد وزارت میں بھی مقدمات فوجداری کے لیے ایک عدالت قائم ہوئی تھی اس کے ناظم مولوی کرامت علی تھے اس زمانے میں بعض عدالتی مقدمات خاص مدارالمہام کے پاس بھی پیش ہوتے تھے اور مدارالمہام جو مناسب جانتے تھے اس کے متعلق حکم دیتے تھے اس حکم کو اکثر

مختصر ذکر دیوانی راجایاں راجہ مہاراجہ راجہ چندو لعل بہادر

کسی قدر بیان کارگزاری عہد پیشکاری مہاراجہ بہادر جو در اصل وہ مدار المہامی تھی بضمن ذکر منیر الملک بہادر مرحوم کیا گیا ہے۔

باقی اجمالاً کیفیت یہ ہے کہ تولد ان کا ۱۱۷۹ھ میں ہوا۔ بعہد سکندر جاہ مغفرت منزل خطاب راجگی و بہادری و عطائے عماری ۱۲۱۲ھ میں۔ خدمت پیشکاری ۱۲۲۴ھ میں۔ خطاب مہاراجگی مع پالکی و نوبت ۱۲۳۵ھ میں اور ایک کرور روپیہ بطور قرض مرحمت ہوا۔ بعد مغفرت منزل کے نواب ناصر الدولہ بہادر نے بصلہ خیر خواہی وہ قرضہ کلہم معاف کر دیا اور ۱۲۴۶ھ میں خطاب راجہ راجایاں راجہ مہاراجہ راجہ چندو لعل بہادر سے سرفراز فرمایا تا آنکہ بعد وفات منیر الملک مرحوم ۱۲۴۷ھ میں مہاراجہ چندو لعل بہادر بالذات مدار المہام بھی ہو گئے تھے۔ نہایت منتظم و زکی و سخی و جفاکش و لائق تھے۔ شب و روز دربارداری و کارگزاری میں سرگرم رہے۔ دربار کے وقت قوال گاتے تھے۔ حتیٰ نصف شب کے وقت بھی شعرا کا دربار منعقد ہوتا تھا جس میں علاوہ اہل ملک و اہل ہند کے شعرا و فضلائے اہل ایران بھی حاضر رہتے تھے۔ اور خوان کرم سے ان کے مستفیض و ماہوار یاب تھے

مجملاً ذکر وزارت نواب فخرالدینخاں شمس الامرا امیر کبیر بہادر

بعد عزل سراج الملک بہادر نقل عبارت مندرجہ تاریخ رشید الدینخانی یہ کہ ۱۲۶۵ھ میں نواب شمس الامرا امیر کبیر بہادر دیوانی سے سرفراز ہو کر سپاس بے قیاس احدیت کا ادا کر کے بقائے دولت و ولی نعمت چاہی۔ پانچ ماہ چند روز کے عرصہ میں اہل غرض نے اعلیحضرت کو بدظن کر دیا۔ مگر اس عرصہ میں تنخواہ جمعیت کنٹنجنٹ ادا کرتے رہے اور انتظام اچھا ہو رہا تھا کہ بار دیوانی سے سبکدوش کیے گئے۔ مگر اتنا ہوا کہ پانچ لاکھ روپے جو بابت کنٹنجنٹ و رسالہ اور پائیگاہ کے اخراجات دیوانی میں فاصل ہو گئے تھے ناحق ان لوگوں کا بھی چوماہا چڑھ گیا اور دنگا ہوئے۔ عادی ماہ بماہ تقسیم لینے کے تھے اذیت اٹھانی پڑی الخ

امیر کبیر بہادر کا تولد ۱۵؍ ماہ رمضان ۱۱۹۵ھ میں ہوا اور ۱۹؍ ماہ شوال ۱۲۷۹ھ میں رحلت ہوئی۔

متخاصمین مال بھی لیتے تھے۔

مہاراجہ چندو لعل کے بعد راجہ رام بخش بہادر وغیرہ کے ذمہ چند سے انصرام امور دیوانی رہا۔

۱۷ ماہ ذیقعدہ ۱۲۶۲ھ میں نواب سراج الملک بہادر دیوان ہو کر حتی الامکان انتظام امور مملکت اور عدل و انصاف کا سامان کر رہے تھے کہ معزول ہو گئے۔

مختصر احوال نواب میر عالم علیخاں بہادر شیر جنگ سراج الدولہ سراج الملک

ان کا سنہ میلاد و حسب و نسب کا ذکر نیر الملک بہادر ثانی کے حالات میں کیا گیا ہے۔ مجملاً یہ کہ بعد عزل نواب امیر کبیر بہادر دوبارہ آخر شعبان سنہ ۱۲۶۷ھ میں مدار المہامی سے سرفراز ہوئے اور تا دم رحلت یعنی ۱ رشعبان سنہ ۱۲۶۹ھ تک اپنے آقائے ولی نعمت کی خیر خواہی و کارگزاری میں حتی الامکان سعی کی اور ادائے فرض منصب کا لحاظ رکھا جیسا کہ سابق کے ہر ایک دیوان کارگزار کو رہا ہے۔ حالانکہ غفران منزل سے اکثر اختلاف رہا ہے۔ سراج الملک بہادر جب کبھی باریاب ہو کر معروضہ کرتے تھے تو غفران منزل کو یہ خیال ہوتا تھا کہ مجھ سے آنکھیں نکال کر باتیں کرتا ہے۔ حالانکہ ان کی بڑی بڑی آنکھیں خلقتاً ویسی ہی تھیں۔ سیدی عنبر خانساماں کا بیان تھا کہ خصوصاً جب نیند سے بیدار ہوتے تھے تو شیر کی سی آنکھیں معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی طبیعت میں استغنائی و بے پروائی تھی جیسی کہ کارگزاران متدین کے طبایع میں ہوا کرتی ہے چنانچہ یہ واقعہ اب تک بین قدما یہاں مشہور ہے کہ جس روز غفران منزل نے وزارت ان سے لے لی تھی اور اس روز مخفی طور پر انکی خبر منگوائی تو معلوم ہوا کہ رقص ارباب نشاط ہو رہا ہے۔ یہ سن کر فرمایا عجب بے پروا آدمی ہے

عالم علیخان بہادر شیر جنگ سراج الدولہ سراج الملک

۱۲۲۴ھ

۱۲۶۹ھ

تعلیم طب انگریزی کا مدرسہ انہیں کے یعنی سراج الملک بہادر کے عہد دیوانی میں بمقام رزیڈنسی ابتداءً قایم ہوا تھا۔ اور مطبع سنگی بمبئی سے منگوایا گیا تھا۔ نیز انتظام عدالت ومیر عدل وغیرہ کی تجویزیں تھیں مگر زندگی نے وفا نہ کی بتاریخ ۱۷ ماہ شعبان ۱۲۶۹ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ تین چار سال میں کیا ہو سکتا تھا خصوصاً اس زمانے میں جس کا بیان آیندہ ہوگا اس زمانے کے لئے تو خالق نے **سر سالار جنگ مختار الملک بہادر اوّل** ہی کو خلق فرمایا تھا جس کی نسبت یہ کہنا زیبا ہے کہ خلاق عالم کو منظور ہوا تھا کہ یہ ریاست ضعیف شدہ از سر نوجوان اور رئیس ورعایا کی آسودگی ومرفہ الحالی کا سامان ہو جائے لہذا ایک انسان ایسے دل ودماغ کا پیدا فرمادیا جس کو اہل یورپ نے بسمارکِ انڈیا کہا ہے۔ واضح ہو کہ مختار الملک مغفور اوّل کے حالات کو مؤلف باب دوم میں بیان کرے گا کیونکہ پہلے زمانۂ قبل مدار المہامی نواب صاحب مغفور کے حالات حتی الامکان بتلانا مقصود ہے۔

———— ⁂ ————

بابِ اوّل

دربیان حالات ریاست حیدرآباد دکن قبل زمانۂ مدارالمہامی نواب میر تراب علیخاں بہادر سر سالار جنگ شجاع الدولہ مختار الملک جی سی ایس۔ آئی ڈی۔ سی۔ ایل۔

پہلے مجملاً کیفیت جمع و خرچ علمہائے سابقہ منجملہ موازنہ جمع و خرچ ۱۲۰۸ف جس کو مولّف نے فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے درج ذیل کی جاتی ہے۔ اور جمع و خرچ عمل مدارالمہامی نواب صاحب مغفور مندرجۂ موازنہ مذکور بیانِ عمل موصوف میں بتلایا جائے گا۔

یہ موازنہ وہ ہے جو ابتدائً حسب الحکم مدارالمہام نواب مختار الملک مغفور اوّل بہ نگرانی کرم الدولہ بہادر مرحوم صدرالمہام مال مرتب ہوا تھا۔ اس کے قبل ممالک محروسہ سرکار عالی کا موازنہ مداخل و مخارج اس ترتیب و تفصیل کے ساتھ کبھی مرتب نہیں ہوا تھا۔

(۳) چونکہ اخراجات معمولی طور پر آمدنی سے زیادہ تھے اس لیے پیشگی رقمیں اور زیادہ نذرانے لینے کا دستور تعہد تعلقات کے لیے تھا اور جلد جلد اہل معاملہ کو موقوف کر دیتے تھے۔ اور مال و املاک در سوم زمینداری ضبط کرنے کا اور مالی عدالتی مقدمات میں جرمانہ و نذرانہ لینے کا طریقہ اسی لیے رواج پایا تھا بلکہ ایسے رقوم ہر ماہ میں بنام فروعی اہل دفتر وغیرہ کے ذریعے سے جمع ہوتے تھے۔ اور جو کچھ کہ رقم دفتر کے ذریعہ سے جمع ہوتی تھی اس کی فردیں بغیر مداخل و مخارج کے دستخطی مہاراجہ متوفی آتی تھیں۔ خالصہ کے تعلقات ادائی پیشگیات و نذرانہ کے لئے پیشگی و نذرانہ دینے والوں کے قبضے میں رہتے تھے بسبب خزانہ خالی رہتے اور وصول نہ ہونے زر تنخواہ کے جمعداروں اور تنخواہ داروں اور قرض خواہوں نے اکثر دیہات و تعلقات اپنی تنخواہ میں بطور تنخواہ جاگیر لے لیے تھے۔ اسی سبب سے لاکھوں روپے محاصل کا ملک تنخواہ جاگیروں میں اور ادائی قرضہ میں مقرر ہو گیا تھا۔ اور بہت کچھ ماہوارین جمیعت و منصب و اقربایان خاص کی برآیندہ ہو جاتی تھیں اور سپاہ بسبب نہ صادر ہونے احکام تنخواہ کے سرکشی کرتی تھی۔ قرض خواہ سختی کے ساتھ تقاضہ کرتے تھے اور اہل منصب وغیرہ بھی تکلیف میں بسر کرتے تھے۔

(۴) مہاراجہ متوفی کے بعد بھی بسبب زیر باری سرکار وہی حالت ابتری و بدنظمی کی روز بروز ترقی کر رہی تھی۔ راجہ رام بخش کی عمل نیکاری میں جمیعت کنیٹجنٹ کی تنخواہ بہت کچھ چڑھنے کے سبب خزانہ رزیڈنسی سے ادا ہو رہی تھی

(۱) چونکہ یہ پہلا موازنہ ہے جو حسب منشاء مقصود خاص لکھا گیا ہے جس میں محاصل و مصارف سنہ ۱۳۱۲ف کا اندازہ جو کچھ ہو مرتب کیا جائے لہذا مناسب ہے کہ پہلے کچھ حالات جمع و خرچ عملہائے سابقہ اور انتظام حال کی افزائشِ محاصل و اعتدال جمع و خرچ بیان کیا جائے۔

(۲) اس کے قبل ایک عرصۂ دراز سے محاصل دیوانی گھٹتا چلا آرہا تھا اور اخراجات بڑھتے جارہے تھے۔ عمل مہاراجہ چندو لعل متوفی کے قبل سے انتظام مال عموماً بذریعۂ تعہد و تعلقداری ہوتا تھا۔ رقم نذرانہ و پیشگی جو زیادہ دیتا انتظام تعلقات اس کے سپرد ہوتا تھا۔ اسی سبب سے اکثر تعہددار اور تعلقدار سختی اور روپیہ کھینچنے میں کمی نہیں کرتے تھے۔ رعایا سے زیادہ لینا اور سرکاری رقم کو گھٹانا ان کا شیوہ تھا اس لیے اکثر تعلقات کی رعایا روز بروز تباہ اور محاصل تعلقوں کا کم ہو رہا تھا۔ اخراجات عمل مہاراجہ موصوف روز افزوں تھے خصوصاً بالائی مصارف۔ ان مصارف کے وجوہ غالباً علاج پذیر نہ ہوں گے ورنہ مہاراجہ متوفی سے لائق و ہوشیار درصورت امکان ضرور اُن کا انسداد کرتے۔ اور جمیعت و منصب کے اخراجات آمدنی سے زیادہ تھے۔ عہد مہاراجہ متوفی کا جمع و خرچ کامل مرتب نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانہ کا جمع و خرچ دیکھنے کے لیے اب کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ فقط مداخل و مخارج ہیں جو کہ قابل اطمینان نہیں۔ ان میں رقوماتِ معمولی عہد مذکور کے سوائے جملہ جمع و خرچ نقدی کا کچھ پتہ نہیں ہے۔

کھیت کاٹنے کے قبل ہی بسبب احتیاج زر مالگزاری کا مطالبہ کرکے کاشتکاروں کو ساہوکاروں کے ہاتھوں میں پھنسا کر سود میں زیر بار کرتے تھے۔ رعایائے دیہات سے پنیات ناجائز لیتے تھے۔ اہل حرفہ بھی پنیات دیتے تھے اور تعلقوں سے نیز عام طور پر بیوپاریوں سے محصول راہداری دہ بہ دہ وصول کرتے تھے۔ غرض ایسے ہی مضرت رساں طریقوں سے رعایا کی حالت تباہ ہوتی تھی۔ زمیندار سرکشی اختیار کرتے تھے رعایا کمزور پائیمال ہوتی تھی۔ زراعت وحرفت گھٹ رہی تھی۔ سرکاری اہل کار جن کے ہاتھ میں تعلقوں کے معاملے تھے نیز دیسکھ اور دیشپانڈیہ سوائے روپیہ لینے اور اپنا نفع کرنے کے دوسرے امر کا خیال ہی نہیں کرتے تھے اس لیے رقم مداخل علاقہ دیوانی سرکار گھٹ گئی تھی۔

(۶) اخراجات مقرری یا کاغذی یعنے مداخل ومخارج دفتر مال میں جس قدر لکھے جاتے اور در اصل وہ بھی فرضی تھے اور مخارج میں اگرچہ سالم تنخواہ وغیرہ خرچ میں لکھی جاتی تھی لیکن اس کی نصف بھی ادا نہ کرتے تھے۔ بموجب مندرجہ ذیل تین قسم کے تھے اور بسا مداخل و اخراجات ایسے تھے جو حسابات سرکاری یا کاغذی میں مطلق لکھے نہیں جاتے تھے۔

(۱) منہا مداخل سے:۔ اور اس میں زیادہ تر رقم سہ بندی وصادر اور رسوم وطنداری اور رقم یومیہ وسالانہ ودیہہ صادر وغیرہ اخراجات متعلق محال محسوب ومجرا ہوتے تھے۔

سوائے دوسرے قرضوں کے فقط تنخواہ کنٹنجنٹ کا قرضہ اسّی لاکھ روپے کے اندازے میں ہو گیا تھا جس کی ادائی مشکل تھی کیونکہ سرکاری اعتبار اس قدر گھٹ گیا تھا کہ ساہوکاروں سے قرض بھی سوائے ضمانت جمعداروں کے ملتا نہ تھا اور سود دو چند سے زیادہ۔ جمعداران عرب وغیرہ سے جو قرض سرکار کو وصول ہوتا تھا تو بحساب فی لاکھ روپے دو دو چار چار سو نفر جوان کی تنخواہ بحساب فی نفر چودہ روپے ماہوار یا کچھ کم جمعیت بھرتی کرنے کے نام سے لیتے تھے خواہ بھرتی کی گئی ہو یا فقط کاغذی عمل ہو۔ بہرحال تنخواہ تو جاری ہو جاتی اور اس کے سوائے سود۔

(۵) سابق زمانے کی طرز انتظام مالگزاری کے اصول و فروع تسلی بخش نہ تھے۔ تشخیص و تحصیل مالگزاری کا انتظام عام طور پر تعہد اور ٹھیکہ کے ذریعے سے تھا اور اگر امانی رکھے جاتے تھے تو تعلقداری امانی کہلاتی تھی مگر اس میں بھی تعلقے کے معاملے تعہد سے دئے جاتے تھے۔ پس وہ تعہد و امانی ہر دو طریقے جو بیان کیے گئے خرابیوں سے خالی نہ تھے۔ جبر و زیادہ ستانی رعایا سے بد قولی اکثر تعلقداروں کے نزدیک معمولی بات تھی۔ اور جمع کے اندازے کا کوئی دستور مقرر نہ تھا۔ ہر سال اضافہ کے ساتھ رقم جمع موضع واری یا پرگنہ واری سر بستہ قرار دیکر اس کی تفریق ہر ایک کاشتکار پر کرتے تھے جو کسی اصول پر مبنی نہ تھی اور دستور بٹائی کا قابل اطمینان نہ تھا۔ تیاری مال کے وقت

نقد یا موقوفی کے لیے تعلقات مذکور کو واگزاشت کر لے اس کے تنخواہی محالات شریک مداخل ومخارج کیے جاتے تھے۔

(۳) اخراجات سوم عام طور پر مصارف ماہوارات وتقاریب علاقہ صرفِ خاص حضور پر نور اور تنخواہ جمعیت ومنصب کے متعلق تھے اور چونکہ رقم مداخل سے بعد مہائی اخراجات متعلق محال اور جو کچھ ادائی پیشگی وغیرہ میں دئے جاتے تھے زیادہ تھے اس وجہ سے عملہائے سابقہ میں اخراجات سرکاری و دیوانی کی کارروائی چھ قسم سے ہوتی تھی۔

۱) ساہوکاروں سے اور جمعداروں سے قرض لیا جانا۔

۲) بذریعہ رہن تعلقات وجواہرات وغیرہ۔

۳) تعلقات پر پیشگی رقمیں لینا۔

۴) نذرانہ وجرمانہ لینا اور ضبطی رسوم وغیرہ اور ضبط کرنا ان اموال کا جن کے وارث قوی نہوں یا وراثت سرکاری محاسبہ میں پھنسا ہوا ہو۔

۵) تعلقاتِ دیوانی کے اس محاصل سے جو زیادہ تر تنخواہی محالات میں اور فاضلات وپیشگیات کی ادائی میں پھنسا ہوا اور باقی ماندہ حصہ بعد وضع ہونے چو تھائی کے جو سہ بندی وصادر میں اور رسوم وغیرہ میں خرچ ہوا ہے جو کچھ باقی رہ جائے۔

(۲) تنخواہ محالات:۔ زرنقد جو خزانے سے خرچ ہونا چاہئے تھا اس کے عوض تعلقات و دیہات محاصلی مساوی رقم سالانہ تنخواہ جمعیت و منصب و ساہوانِ قرض خواہ کے حوالے ہوتے تھے۔

(۳) مخارج نقد خزانہ اور محالات سے:۔ جن میں سرکاری علاقے کے اخراجات اور تحریر دیوانی و بنیکاری اور تنخواہِ جمعیت و منصب و شاگرد پیشہ کے اخراجات، اور بعض جمعیت قلعہ جات کے اور کسی قدر یومیہ اور بعض متفرقات شامل تھے۔

(۷) (۱) قسم اول سہ بندی و صادر میں جو اخراجات لکھے ہیں وہ اخراجاتِ واقعی کے طور پر نہ تھے بلکہ اکثر فی روپیہ ۲ر کے حساب سے مقرر تھے اور دراصل ان میں کے نصف بھی خرچ واقعی میں نہ آتے تھے۔ بلکہ دوسرے اخراجات رسوم و یومیہ وغیرہ متعلق محال جو فی روپیہ ۲ر کے سوائے تھے وہ بھی مستحقوں کو برابر نہیں پہونچتے تھے لیکن تعلقدار و تعہد دار سرکار سے اخراجات مذکور لازمی طور پر ہمیشہ سبیل بندی کے رو سے پورے مجرا لیتے تھے۔ یہ بھی ایک بڑا سبب تھا نقصانِ سرکاری و محرومی مستحقین کا کہ جس خرچ کے نام سرکار سے رقم مجرا لی جاتی تھی اس میں خرچ نہیں ہوتی تھی۔

(۲) اخراجات قسم دوم یعنے تنخواہی محالات حقیقت میں جمع و خرچ کے حساب سے خارج تھے۔ لیکن چونکہ تعلقات و دیہاتِ خالصہ کی تنخواہیں جمعداران و منصبداران وغیرہ کے عوض مقرر ہوئی تھیں اور سرکار کو ہر وقت اختیار تھا کہ اجرائے تنخواہ

٦) اکثر ماہوارات جمعیت و منصب وغیرہ کو بر آیندہ رکھدیا جانا۔

٧) (الف) ۱۲۶۳ھ میں جو اخیر عمل دوم سراج الملک مرحوم کا تھا مداخل و مخارج دیوانی حسب ذیل تھے۔

کیفیت مداخل تعلقات دیوانی

مداخل	رقم	
محالات تنخواہی صوبہ حیدرآباد و بیدر	لک [illegible]	
محالات تنخواہی صوبہ برار و اورنگ آباد و بیجاپور	لک [illegible]	لک [illegible]
محالات مفوضہ عمالان دیوانی صوبہ حیدرآباد و بیدر	لک [illegible]	
محالات مفوضہ عمالان صوبہ برار و اورنگ آباد و بیجاپور	لک [illegible]	کرور لک [illegible]
		کرور لک [illegible]

واضح ہو کہ یہ مداخل اس وقت کا ہے جو صوبہ برار وغیرہ قبضہ سرکار عالی میں تھا۔ سرکار انگریزی میں جانیکے بعد جو مداخل تھا اس کا اظہار آیندہ کیفیت جمع و خرچ عمل مدار المہامی مغفور اول مندرجہ موازنہ مذکور میں ہوگا۔

چار روپے کو کبھی تین روپے کو پلہ۔ گھی روپے کو تین سیر کبھی اس سے زیادہ بیشی تنگر روپے کو چھ سیر۔ علی ہذا القیاس مونگ مسور وغیرہ ہر چیز ارزاں تھی۔ ورنہ خدا جانے کیونکر بسر ہوتی۔ ویسی حالت اس زمانے کے جاگیرداروں کی بھی تھی۔ جاگیردار برائے نام تھے۔ جاگیر زمینداروں کے قبضہ میں عربوں کے ہاتھ میں یا ساہوکار وغیرہ کے پاس رہن۔ سال ہا سال گزر گئے حساب نہ کتاب ادائی کا نام نہیں۔ جاگیر سے کام نہیں بطور خیرات بہزار منت جاگیردار کو کھانے کے لیے کچھ دے دیتے تھے۔

نیز اس زمانے میں ایک دستور ناجائز تھا کہ کسی مرشد زادے وغیرہ دولتمند کا انتقال ہوا تو فی الفور اس کے مال و متاع پر سرکاری ضبطی جاتی تھی اگرچہ متوفی کے حقدار ہوں۔

معاذ اللہ کس قدر بدنما اور خلاف شرع و خلاف قانون طریقہ تھا جو باعث تباہی خاندان و موجب حق تلفی و دل آزاری حقداران ہوتا تھا۔ ایک تو گھر کے وارث کا اٹھ جانا اس پر یہ تباہی ورثہ۔ چنانچہ تاریخ خورشید جاہی میں مرقوم ہے کہ ماہ صفر ۱۲۶۹ھ میں مہتا صاحب نواب کلیانی کا انتقال ہوا تو حسب الحکم سرکار عالی محمد وزیر کوتوال معزول نے جا کر تمام مال و متاع ضبط کرلایا۔ جملہ نقد انتیس ۲۹ ہزار روپے اور چھ ۶ سو اشرفیاں داخل خزانہ ہوئیں۔

نیز قدیم زمانے میں یہ دستور تھا کہ بغیر حصول اجازت کوئی شخص دومنزلہ

گزارش مولّف ۔ کیفیت مداخل، مخارج مذکورہ سے ظاہر ہے کہ ویسی حالت میں
جمعیت اور منصبداروں کی تنخواہ ماہ بماہ کیونکر جاری رہ سکتی تھی ۔ اس زمانے کے
بعض بزرگ جو ہنوز موجود ہیں بیان کرتے ہیں کہ بہزار سعی و دربارداری بزرگانِ
عالہ بہادر چند منصبداروں کی تنخواہ کے لیے بنام تعلقدار ضلع کئی سال میں ایک مرتبہ
احکام جاری ہوتے تھے تو چار و ناچار بہزار مصیبت تعلقدار کے پاس جاکر ہنڈوی
لاتے تھے ۔ بخوف بدامنی راہ رقم نہیں لا سکتے تھے ۔ بعد وضع ہنڈاون رقم تنخواہ
وصول کر کے حوالہ بقال محلہ کرتے تھے کیونکہ اس سے قرض لے کر اب تک بسر کرتے
رہے اور آیندہ بھی اس سے لینا ہے ۔ خدا جانے تنخواہ پھر کب میسر ہو ۔

اس زمانے کے منصبداروں کی حالت پر افسوس ہوتا ہے کہ تعلقداروں کے
پاس جانے آنے کے مصارف و مصائب سفر ۔ اور محلہ کے بقّال کا قرضہ اور غلہ
وغیرہ کی قیمت کا جو بسبب اودھار کے گراں و ناقص دیا ہے ۔ اور سود اس قرضہ کا
جو بالائی مصارف کے واسطے ماہانہ دس پانچ روپیہ نقد دیتا تھا تو وہ بھی یکمشت
نہیں دیتا تھا بلکہ بدفعات ۔ بدفعات بھی روپے نہیں بلکہ خوردہ دیتا تھا وہ اس لیے کہ
بازار کے نرخ سے فی روپیہ پیسہ دو پیسے کم دینے کا موقع ملے ۔ اس خوردہ میں بھی دو چار آنے کی کوڑیاں ۔
ہر حال بیچارے منصبدار بسبب نایابی تنخواہ ہمیشہ بقال اور ساہوکاروں کے محتاج و دست نگر
رہتے تھے ۔ اس زمانے کو مخلوق کے لئے ارزانی غلہ و اجناس نہایت جان بخش تھی چنانچہ باریک چاول
زیرہ گا ہے چودہ[۱۴] روپے کو پلہ ملتے تھے ۔ موٹے چاول آٹھ[۸] یا نو[۹] روپے کو گیہوں دس[۱۰] روپے کو پلہ جوار

اگر کہیں روپیہ چھپا رکھا ہے تو بتلا دے۔

از روئے تاریخ رشید الدین خانی راجہ رام بخش پیشکاری پر معمور اور جملہ امور ریاست ان سے متعلق ہوئے۔ دراصل گویا دیوان تھے۔ بمجرد سرفرازی باوجود زیادتی مخارج و کمی مداخل ریاست دروازہ جود و سخا کا کھول دیا۔ بڑی بڑی ماہوار کے لوگ نوکر رکھے۔ کم مواجبوں کو بے سبب اضافے کیے۔ آسامیان میانے اور ہاتھیوں کی دیں۔ جاگیریں عطا ہوئیں چنانچہ دفتر سے ثابت ہوا کہ چھ ہزار آدمی اٹھارہ لاکھ روپے سال کے جدید نوکر رکھے۔ عربوں سے بہت سا روپیہ قرض لے کر تعلقات ان کے قبضے میں دے دیے۔ عمال پیشتوں سے عوض دو سالہ پیشگی لے کر اپنے تصرف میں لائے۔ سوائے اس کے جوانی جاگیرداروں سے بھی تحصیل کی عام خلقت بلدہ کی پریشاں روزگار۔ شرفا تکلیف زدہ۔ صدا الجوع کی ہر طرف سے بلند۔ جب دار السلطنت کا یہ حال تھا تو تعلقات کا کیا حال ہوگا۔ اکثر دنگا فساد خونریزیاں تھیں۔ میر علی جمعدار کے مکان پر ستر آدمی مارے گئے علیٰ ہذا القیاس ہنگامے برپا تھے تا آنکہ پیشکاری سے موقوف ہو گئے۔ بعد ازاں گنیش راؤ بھی چند ساعت کے لیے دیوان ہو کر موقوف ہو گئے۔

جب ان اضلاع کا حساب شایع ہوا جو ۱۸۵۳ء م ۱۲۷۰ھ میں سرکار کمپنی کو سپرد کر دیے گئے تھے تو ثابت ہوا کہ ان اضلاع کے تعلقدار سرکاری مالگزاری کا بہت کم حصہ سرکار نظام میں داخل کرتے تھے۔ عموماً ایک ربع آمدنی سے لے کر

یا پختہ مکان تعمیر کرنے کا مجاز نہ تھا۔ اور حصول اجازت دشوار۔ بعد زمانہ میر عالم مرحوم جو کچھ حالت رہی اب تک مشہور رو بین قدر مذکور رہے کہ جو تعلقدار منجانب سرکار معمور ہو کر جاتا تھا بسبب عدم اطمینان بقائے خدمت شب و روز فکر تحصیل واخذ زر میں رہتا تھا کہ مبادا دوسرا تعلقدار میری جائے پر معمور ہو کر آجائے۔ بعض تعلقدار دیڑا تی اور دہ انی پر تعلقداری کرتے تھے یعنے ماہوار تعلقداری کے عوض فی روپیہ دیڑآنہ یا دو آنے لیتے تھے جس میں مصارف عملہ وصادر وغیرہ شریک تھے مگر یہ دو آنے برائے نام تھے در اصل روپے میں آٹھ آنے کے مالک تھے۔ نیز بسا تعلقات ٹھیکہ سے دیے جاتے تھے یعنی ٹھیکہ۔ نایبان، سررشتہ داران، دیسکھ، دیشپانڈیہ، پٹیل پٹواری وغیرہ کے ہاتھوں میں رعایا پھنسی ہوئی تھی۔ تعلقدار یا ٹھیکہ دار سے لے کر پٹواری تک ہر ایک کو تحصیل زر کی فکر رہتی تھی انسام کی پٹیاں ناجایز لیجاتی تھیں یعنے امرائی پٹی۔ بن چرائی۔ شہر سدھارنی۔ سائردہ بدیہی۔ محصول در آمد غلہ۔ مخترفہ۔ پٹیات خفیف یعنے پٹی دہنگران پٹی دہیڑان۔ شادی پٹی۔ چرسہ پٹی۔ لون پٹی۔ ہاٹ بازاری۔ کلال پٹی۔ جولائی پٹی۔ دہارا پٹی۔ راہداری۔ غنیم باب۔ بورال پٹی۔ لوٹ سبزی۔ بانس فروشی مذکور پٹی۔ رسوم ریدی وغیرہ۔ ہنگام اچھا ہو یا خراب ہو اپنی تحصیل سے غرض رکھتے تھے۔ جو رعیت زر نقد یا ضمانت ساہوکار کی نہ دیتا تو اس کے گھر کا سامان اور مویشی جملہ ضبط کر لیتے۔ اور اس کے سر پر پتھر دے کر دھوپ میں کھڑا کرتے تھے

جس کی برسوں کسی نے خبر بھی نہ لی۔

واضح ہو کہ زمانہ سابق میں خود ریاست و امرائے ریاست و جاگیردار جملہ قرضہ میں مبتلا تھے۔ اس زمانے میں ساہوکار اتنے اور ایسے جیسے کہ اب ہیں مالدار دراصل تھے بھی نہیں۔ جو کچھ تھے سوان کا فقط سرکار عالی پر دو کروڑ ستر لاکھ روپیہ برآئندہ تھا لہٰذا وہ عدم اطمینان ادائی کی وجہ سے بہت کم کسی کو قرض دیتے تھے اس لئے اکثر امرا و جاگیردار وغیرہ عربوں کے اور رہدوی پٹھانوں کے قرضہ میں پھنس رہے تھے۔ اور خود سرکار عالی کو بھی ادائی تنخواہ کنٹنجنٹ وغیرہ کی ضرورت ہوتی تھی تو عربوں سے اور پٹھانوں سے بہت کچھ سود پر قرض لیا جاتا تھا اور لاکھوں روپے کے تعلقے بطور رہن دیدیے جاتے تھے چنانچہ ازروے مرقعہ عبرت یہ پایا گیا کہ ۱۸۵۰ء مطابق ۱۲۶۶ھ میں ایک کرور سے زیادہ آمدنی پر عربوں اور پٹھانوں کا قبضہ تھا۔ الغرض ریاست اس قدر زیر بار و قرضدار تھی کہ اس کی ادائی کے لیے مجبوراً غفران منزل نے شاہی جواہر رہن فرمایا تھا۔ بالآخر وہ جواہر بغرض فروخت باستصواب مسٹر ڈائیٹین انگلستان روانہ کیا گیا تھا جس کی واپسی کا ذکر باب دوم میں آئے گا۔

ارشاد مبارک شاہ اولیا علیہ التحیۃ والثنا۔ الھم ھم الدین (فکر اگر ہے تو قرض کی ہے فکر) نہایت درست ہے۔ انسان کیسا ہی غیور و عالی مرتبہ ہو عدم امکان ادائی کی حالت میں اپنے قرضخواہ سے عاجز ہو جاتا ہے۔ مقام غور ہے کہ سرکار نظام کو

نصف آمدنی تک خود کھا جاتے تھے۔ مثلاً ضلع میکھور ملک برار کی آمدنی تعلقدار کے حساب میں ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے مندرج تھے حالانکہ اصلی آمدنی ایک لاکھ نو ہزار تھی۔ اسی طرح بہت سے اراضی ملک برار میں قابل تردد ایسے تھے جو نقشہ جات میں غیر مزروعہ دکھائے جاتے تھے یا اس کا مطلق ذکر ہی نہ ہوتا تھا۔

جب ملک برار گورنمنٹ کمپنی کو دیا گیا تو اس کے شمالی حصہ میں مزروعہ زمین کی مقدار چار لاکھ پچیس ۲۵ ہزار بیگہ ظاہر کیجاتی تھی حالانکہ پیمائش میں سترہ ۱۷ لاکھ بیگہ سے زیادہ معلوم ہوئی۔ چنانچہ بعلاقہ ملک برار ۱۸۵۳ء میں کرنیل ہڈویلر ضلع نلدرگ کے افسر مقرر کیے گئے تھے تو انھوں نے اس بارے میں حسب ذیل تحریر کیا ہے۔

گورنمنٹ نظام کے تعلقداروں کو بے انتہا فائدہ تھا۔ یہ لوگ بڑا حصہ مالگزاری کا مقامی سکہ کے حساب سے وصول کرتے تھے جو بحساب بازار کمپنی روپے سے کچھ کم تھا۔ لیکن بجائے اس کے کہ ہنڈاون کا فائدہ وہ سرکار کو دیں حیدرآباد میں بذریعہ ہنڈوی کے بھیجتے تھے جو وہاں شہر کے کم قیمت روپے سے بدل جاتی تھی۔

اب غور کرنا چاہیے کہ جب حیدرآباد کے ایک صوبے میں یہ اندھیر تھا تو اور اضلاع میں کیا اندھا دھند ہوگی۔ نلدرگ کا ضلع جب سرکار انگریزی کو سپرد کیا گیا تو پہلے ہی سال اس کی آمدنی ایک لاکھ تینتیس ۳۳ ہزار روپے زیادہ ہوگئی۔ ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں اس وقت کیسی لوٹ مچی ہوئی تھی۔

ایسا بولے کہ اگر اس وعدے پر تم روپے نہ پہونچاؤ گے تو تمہارا منہ کالا ہوگا۔

حضور بولے نہیں جی ضرور پہونچائیں گے۔ الخ۔

مقام غور ہے کہ غفران منزل سا الوالعزم بادشاہ اور سراج الملک بہادر سا وزیر غیور طبع کو بسبب بے سرانجامی ریاست و مقتضائے وقت صدمات دلی کس قدر برداشت کرنی پڑی تھی۔

یہی ایک حالت سابقہ ریاست نظر میں رکھیں تو مختار الملک مغفور اول کا حسن انتظام وکمال خیر خواہی سلطنت ناظرین باانصاف پر منکشف ہونے کو کافی ہے۔

الحاصل اس زمانے میں عرب خصوصاً چند بڑے جمعدار عربوں کے عبداللہ بن علی مدبر جنگ سیف الدولہ عمر بن عوض جانباز جنگ شمشیر الدولہ وغیرہ جمعدار بھی تھے تعلقدار بھی تھے۔ ساہوکار بھی تھے۔

جمعداری کا یہ حال کہ ہر جمعدار کے آوردہ میں کئی ہزار نفر عرب ملازم سرکار لیکن کبھی کسی نے دخل ان کا دیکھا نہ وہ کسی کو داخلہ بتلاتے تھے۔ ملازم عربوں کی تنخواہ کے لیے خزانہ عامرہ اور اس میں رقم کہاں تھی جو ماہوار تقسیم ہوتی۔ اس لئے کئی لاکھ روپے محاصل کے تعلقات سرکاری کو جمعداروں نے اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ سالہاسال حساب نہ کتاب علاوہ برآں بذریعہ مقربان بارگاہ خسروی نذرانہ داخل کر کے بحیثیت تعلقداری لاکھوں روپے محاصل کے تعلقے حاصل کرلئے تھے۔ مقام غور ہے کہ حضرات عرب نے کیسی تعلقداری ہوگی۔ خاص پائے تخت یعنی بلدہ میں

باوجود کمال اتحاد وارتباط سرکار انگلشیہ سے بسبب قرضہ متعلق ماہوار کنٹجنٹ کس قدر کاہشیں اٹھانی پڑی ہیں اور تقاضائے ادائیمن کیسے کیسے الفاظ نا ملایم وخلاف شان کے متحمل ہونا پڑا ہے۔ ملاحظہ ہو تاریخ رشید الدین خانی کا تیسرا دفتر حکام متعلقہ کے بیان میں متعلق واقعہ در بارہ مطالبہ رقم سرکار انگریزی جس کی اصل عبارت یہ ہے۔ کہ جب خود بدولت نے فرمائے کہ جس وقت ہم بذات خود متوجہ اس کام کے تھے اس وقت تمھاری ماہوار ماہ بماہ پہونچتی رہی ہے۔ ڈیوڈسن صاحب نے عرض کی کہ اس وقت بھی باقی رہ گئی تمام نہیں پہنچی۔ ہاں مگر شمس الامرا بہادر امیر کبیر کی عملداری میں برابر پہنچی ہے۔ بلکہ فاضل پہنچی ہے پھر خود فرمائے کہ ہمارے وقت کے رسیدات تمہارے حاضر ہیں۔ اور حکم ہوا کہ سیف جنگ کو بلاؤ۔ معزالیہ حاضر ہوئے اور عرض کی درست ہے۔ اس وقت بھی ان کی ماہوار رہ گئی ہے۔ اس میں سراج الملک بہادر درمیان آئے اور ایسا بولے کہ غلام اپنے عمل میں بھی کچھ باقی نہیں رکھا ماہ بماہ پہونچاتا رہا ہے۔ کرنل جان لو صاحب نے کہا کہ جھوٹ کہتے ہو بہت سی باقی رہی ہے۔"

نیز اسی تیسرے دفتر میں ایک اور دربار کی کیفیت جو بیان کی ہے اس کی اصلی عبارت یہ ہے کہ "سراج الملک بہادر نے ایک چٹھی جیب سے نکال کر دکھلائی اور ایسا کہا کہ یہ تجویز ہوئی ہے۔ کرنل جان لو صاحب نے کہا مجھے اعتبار نہیں تب سراج الملک بہادر نے حضور سے عرض کیا کہ دو تین روز میں دس لاکھ روپے تو بابجا ہو جاتے ہیں۔ جب کرنل جان لو نے سراج الملک بہادر کی طرف دیکھ کر

اہتمام کیا اور بوقت شب بالباس معمولی و دستار وغیرہ پنس میں میت کو سوار کرکے جوانان و خادمان ہمراہی پنس کو گھیرے ہوئے ڈیوڑھی میں لائے اور اسی شب کو بہ کمال عجلت و اخفا امور تجہیز و تکفین و تدفین طے کر دیے گئے۔ بعد ازاں دوسرے روز عام طور پر سب کو معلوم ہوا کہ سراج الملک بہادر کا انتقال ہوا اور دفن بھی ہو گئے۔ کوئی امیرزادہ بلا کفالت جاگیر و جائداد اُن کے قرضہ میں پھنستا تھا اور وعدہ ادائی وفا نہ ہوتا تھا تو اس کو گرفتار کرکے اپنے قید میں رکھتے تھے اور کھانے کو نان خشک دیتے تھے بلکہ بعضوں کو فاقے۔ اور توڑوں کے چرکے دیتے تھے تاکہ کوئی جایداد ہو تو نکلا دے یا اس کے ورثہ ادائی کی سبیل کرکے مدیون کو چھڑالیں۔ اور مدیون کے گھر پر عربوں کا پہرا بیٹھ جاتا تھا۔ کسی کو اندر سے باہر نکلنے دیتے تھے نہ باہر اندر جانے دیتے تھے۔

چنانچہ مولّف نے اپنے والد مرحوم سے چشم دید واقعہ سنا ہے کہ بزمانہ مدارالمہامی سراج الملک مرحوم۔ میر موسیٰ رضا خاں ابن سید عاقل خاں مرحوم نبیرہ بہرام الدولہ مرحوم کو عرب لوگ اپنے قرضہ کے لئے پکڑ کر سرورنگر سے پیادہ پا بلدہ میں لائے اور قید کیا۔ سید زین العابدین سطوت جنگ مرحوم جدّ نواب بہرام الدولہ بہادر حال کو جب یہ خبر ملی تو بوجہ برادری متاسف ہوئے اور سراج الملک بہادر سے عرض کرکے امیرزادۂ موصوف کی رہائی کرائی۔ الحاصل عربوں کا زور و شور زمانۂ سابق میں جو کچھ تھا اب تک مشہور ہے۔

جن کا جبقیہ ذری ذری بات پر نکل پڑتا تھا تو تعلقات و دیہات کی بیچاری رعایا پر کیا گزری ہوگی۔ ساہوکاری کی یہ صورت کہ جس جاگیردار نے ان سے تھوڑا بھی قرض لیا تو عمر بھر اس قرضہ سے نجات دشوار ہوتی تھی۔ علاوہ خاطر خواہ سود وغیرہ کے دس یا پندرہ یا بیس عرب حسب حیثیت قرضہ اس جاگیردار مدیون کی ڈیوڑھی پر برائے نام متقرر ہو جاتے تھے کہ یہ نوکر آپ کے ہیں۔ اور دراصل حسب تعداد عروب بندوقیں کھونٹیوں سے لگا دی جاتیں۔ اگر کوئی کہتا کہ عرب تو دو ہی حاضر رہتے ہیں اور نام تو دس یا پندرہ عربوں کا ہے تو جواب ملتا تھا کہ بروقت ضرورت دیکھ لینا سب حاضر ہو جائیں گے۔ بیکار کیوں حاضر رہیں۔

اس تقرر سے عربوں کا مقصد یہ تھا کہ فی اسم دس بارہ روپے ماہوار کے حساب سے جملہ عربوں کی ماہوار بھی مدیون کے ذمے لگائی جا کر شریک قرضہ مدیون ہوتی جاتی تھی۔ ہر گاہ کوئی امیر وغیرہ فوت ہو جاتا تھا اس کے قرض خواہ عرب یا پٹھان دروازہ پر مدیون کے بیٹھ جاتے تھے اور جب تک ضمانت معتبر وغیرہ سے ادائی قرضے کا خاطر خواہ تصفیہ نہ ہوتا تھا میت کو مدیون کی اٹھانے نہ دیتے تھے۔

چنانچہ سراج الملک بہادر علیل ہو کر بغرض تبدیل آب و ہوا اپنی جی کی کوٹھی میں جو فی الحال محسن الملک کی کوٹھی کہلاتی ہے مقیم تھے۔ اور وہیں بحالت خدمت وزارت انتقال ان کا ہوگیا تو بخوف عروب و افغانان وغیرہ طلب گاران تنخواہ بر آیندہ۔ خبر انتقال کو مخفی رکھنے میں اہلکاروں نے نہایت

ایک روز عرب مذکور تعلقدار کو جبراً ساہو مذکور کے پاس لایا کہ قرض کی ادائی اس ساہو کار سے کرادو۔ ساہو کار مذکور نے اس معاملے سے کنارہ مناسب جانا اور جاگیرات مذکور عمر بن عوض جمعدار کے پاس رہن کر دے کر اپنا روپیہ وصول کر لیا۔ لہذا صالح عرب مذکور ساہو کار کا مدعی ہو کر تابو میں تھا تا آنکہ ایک روز اثنائے راہ میں ساہو کار مذکور کو پکڑنا چاہا اس کے ساتھ راٹھور تھے۔ تلوار چلی کچھ عرب زخمی ہوئے دو راٹھور مارے گئے۔ مگر ساہو کار مذکور بچ کر نکل گیا۔ اس کو کچھ عرصہ گزرا تھا کہ ساہو کار مذکور کے متعلقین اپنے ہمقوم کی شادی میں سکندرآباد گئے تھے۔ وہاں سے واپسی کے وقت احتیاطاً وہاں کے کمشنر سے ایک چپراسی ہمراہ لیے ہوئے آ رہے تھے۔ عرب مذکور نے خبر رکھ کر توپ کے سانچہ کے پاس کی سڑک پر انھیں گھیر لیا۔ پھر لڑائی ہوئی دو راٹھور مارے گئے اور متعلقان ساہوئے مذکور کو پکڑ لیا گیا۔

چونکہ کمشنر سکندرآباد کا چپراسی ہمراہ تھا اس کا لحاظ عربوں نے مطلق نہ کیا۔ لہذا رزیڈنٹ بہادر کے پاس سے تقاضا ان آسامیوں کا جن کو عرب پکڑ لے گئے تھے ہونے لگا۔ سراج الملک بہادر نے عرب مذکور کو طلب فرما کر ہرچند فہمائش کی مگر مطلق اثر نہ ہوا۔ آخر کار بمقتضائے وقت ادائی قرضہ عرب کا ذمہ لے کر آسامیوں کی رہائی کی۔

سنہ ۱۲۶۰ھ میں سراج الملک بہادر ممدوح کے بھائی اکرام الدولہ بہادر

بعض مسن لوگ بیان کرتے ہیں اور مشہور نقل ہے کہ ایک عرب صاحب نے راہ میں کسی شریف سفید پوشں سے ملاقی ہو کر ایک دست آویز پیش کی کہ اس میں کیا لکھا ہے ذرا پڑھ دو۔ اس بیچارے نے پڑھ کر کہا کہ یہ چار سو روپے کا تمسک ہے۔ یہ سنتے ہی عرب صاحب بگڑے کہ پانسو کے تمسک کو چار سو روپے کا کہتا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ تم کسی اور سے پڑھوالو اس میں تو چار سو روپے لکھے ہیں۔ یہ سن کر بکمال غیظ و غضب تمسک مذکور کو چاک کر کے پھینک دیا اور اس شریف آدمی کے گلے میں رومال ڈال دیا کہ اچھا چار ہی سو روپے اس وقت دے دو ہر چند وہ بیچارہ نالاں ہے کہ عرب صاحب میں کیا جانوں تم سے کب میں نے روپے لیے مگر مانتا ہی کون تھا لے چلا کھینچتا ہوا۔

رشید الدین خانی میں مرقوم ہے کہ ۱۰ محرم ۱۲۵۲ھ میں رہیلوں اور عربوں کا ایک جا مکان پر حسین یاور جنگ کے دنگا تھا۔ کسی بات پر تکرار ہو کر باہم ہتیار چلے۔ یہ خبر جو منتشر ہوئی۔ جہاں جہاں عرب اور روہیلے ایک جائے تھے یا ملاقی ہوے باہم خونریزی کرنے لگے۔ ہر کوچہ و بازار میں لاشیں مقتولوں کی پڑی تھیں۔ صلح کے بعد عربوں نے نذرانہ معقول سرکار میں داخل کر کے رہیلوں کو اخراج کرایا۔

غلام قوی خاں تعلقدار ساکن بلدہ ایک عرب مسمی صالح بن اعزبی کے قرضدار تھے تعلقدار مذکور کی جاگیر میں فتح چند ساہو ساکن رزیڈنسی کے پاس گرو تھیں

بہت کچھ ہائے وائے کیا کوتوالی میں دوڑے فریاد فریاد کہا کچھ بھی نہ ہوا۔

تاریخ رشید الدین خانی میں مرقوم ہے کہ ماہ ذیحجہ ۱۲۶۲ھ میں تمام پٹھان اور عرب جمعدار وغیرہ در دولت شاہی پر بھی دنگا بیٹھے تھے ۔

عربوں کے زور و شور کی وجہ اس عہد میں یہ تھی کہ ان کے جمعدار جیسے کہ دولتمند و صاحب جمعیت اس ریاست میں ہو گئے تھے ویسا کوئی دوسرا نہ تھا۔ از روے تصرف ملک و افراط مال گویا رکن سلطنت تھے۔ علاوہ برآں بڑی وجہ یہ تھی کہ ان میں باہم کمال اتفاق تھا۔ اگر کوئی غیر عرب کسی عرب کو ضرر خفیف بھی پہونچاتا تھا تو اس کے انتقام کو جملہ عرب مستعد ہو جاتے تھے ۔ یہ اتفاق یہاں کے کسی فرقے میں نہ تھا نہ پولیس ایسی تھی کہ جس کا خوف عربوں کو ہوتا ۔ حالانکہ یہ لوگ اس ریاست میں کوئی ایسی قدامت بھی نہ رکھتے تھے ۔ پہلے یہ فرقہ ناگپور اور پونا کی ریاست میں ملازم تھا۔ وہاں سے علحدہ ہو کر جمعدار عمر بن عوض جانباز جنگ شمشیر الدولہ مع ہمراہی اس ریاست ابد مدت میں بعہد نواب سکندر جاہ بہادر آئے اور ملازم ہوئے۔ سنا گیا ہے کہ وہاں سے بابت تنخواہ وغیرہ بہت کچھ نقد و جنس پیدا کر لائے تھے ۔ یہاں آنے کے بعد رفتہ رفتہ ان کے زر و زور نے اور بھی ترقی کی تا آنکہ عہد مدار المہامی مہاراجہ متوفی میں ان کی ترقی درجۂ کمال کو پہنچ گئی ۔ صاحب خطاب و امیر معظم ہو گئے ۔ نواب صاحب مغفور دیوان ہونے کے بعد بھی ایک عرصہ تک اس فرقہ کا زور و شور رہا ہے کیونکہ انتظام ان لوگوں کا

نے بھی جن کا مکان ایرانی گلی میں تھا محفوظ بن طیران عرب سے قرض لیا تھا۔ اس کے تقاضے میں بالمشافہ سخت گفتگو ہوئی تاآنکہ عربوں نے بہادر موصوف کو مع فرزند جوان مار ڈالا۔

اگر کسی سے کسی امر میں گفتگو ہوتی اور عرب صاحب کے سخت الفاظ کا کوئی برابر جواب دیتا تو فی الفور جنبیہ سے مارا جاتا۔ کوئی عرب کسی کو زخمی یا قتل کرکے کسی جمعدار کے قہوہ خانے میں یعنے عربوں کی نشست میں چلا جاتا تھا تو کسی کی مجال اس کو گرفتار کرنے کی نہ تھی۔

اس واقعہ سے بھی بعض مسن لوگ ہنوز واقف ہیں اور رشید الدین خانی میں بھی مرقوم ہے کہ ایک شریف منصبدار شاعر شہید تخلص ایک جمعدار عرب کے ہمسایہ میں رہتے تھے ان کی ایک لڑکی جو ہنوز نابالغہ تھی اس کی خواستگاری برادرزادہ و داماد جمعدار ناصر نام رستم جنگ نے کی۔ منصبدار مذکور نے انکار کیا۔ اس کو چند روز گزرے تھے کہ ایک روز بعد مغرب فقیر دروازے پر آکر سوال کیا۔ اس وقت خادمہ یا از قسم ذکور گھر میں نہ تھا۔ حسب الحکم مادر وہی دختر روٹی دینے کو دروازے کے پاس گئی اور غائب ہوگئی۔ جب عرصہ ہوا تو ماں پکارتی ہوئی دوڑی دیکھا دختر نہیں۔ ہر چند چلائی تلاش کی گئی اصلاً پتہ نہ ملا تاآنکہ دوسرے روز علی الصباح منصبدار مذکور نے اپنے گھر کا دروازہ جو کھولا تو دیکھا کہ ایک گٹھڑی پڑی ہوئی ہے اس کو کھول کر دیکھا تو اپنی دختر گمشدہ کی لاش ٹکڑے ٹکڑے کی ہوئی پائی۔

واجب القتل پر فیر کردی جاتیں۔ دس میں اقلاً چار پانچ گولیاں تو ضرور کارگر ہوجاتیں کیونکہ بندوقیں چلانے والے جملہ مدعی خون یعنے مقتول کے قرابتدار ہوتے تھے پھر کیوں قاتل کی رعایت کرتے۔ الغرض اس قسم کی خودسریاں اور بے باکیاں اس فرقہ کی بہت کچھ تھیں اور بسا واقعات ان کی تعدی اور خونریزیوں کے ہوئے ہیں مگر یہاں منظور اختصار ہے۔

اب حال دوسرے فرقہ کا جو درجہ دوم میں ایسے ہی پرزور و شور تھے بیان کرنا مقصود ہے یعنی فرقہ افغانان مہدویہ۔ اب تک یہاں کے خاص وعام میں یہ بات مشہور ہے کہ عرب جس طرح اپنے مدیون کو قید کرکے توڑوں کے چرکے دیتے تھے یہ فرقۂ دوم بھی اپنے مدیون کو مقید کرکے مرغوں کے جھانپ میں بند کرتے تھے اور مانند مرغوں کے بانگ دو کہتے تھے۔ اگر نہ دیتا تو اس کو اذیت دیتے تھے۔ کتاب ہدیہ مہدویہ تالیف مولوی محمد زماں خاں مرحوم سے معلوم ہوا کہ بزمانۂ پیشکاری مہاراجہ چندولعل متوفی اس فرقہ کی ابتداءً یہاں ترقی ہوئی خاص اس فرقہ کے حالات میں لالہ برجناتھ المتخلص بہ خیال نے ایک مختصر کتاب بطور وقایع بزبان فارسی تالیف کی ہے اور وہ ۱۲۳۰ھ میں طبع بھی ہوئی ہے۔ اس کا ترجمہ اُردو میں بطور خلاصہ مولف نے کیا ہے اور کتاب مذکور میں اس فرقہ کی نسبت جو سخت کلمات استعمال کیے گئے ہیں ان سے غرض نہ رکھ کر فقط واقعات کو لے لیا ہے لالہ برجناتھ کا بیان ہے کہ یہ مہدوی پٹھان بتدریج جمع ہوکر بیرون دروازۂ

جلد ہونا محالات سے تھا۔ مولف نے دیکھا ہے کہ ایک عرب دوکان پر بنئے کی سودا خرید کرنے کو آیا اور حسب خواہش اس کے بنئے نے چرونجی خشخاش وغیرہ لا کر روبرو رکھا۔ نرخ طے ہونے اور وزن کرنے تک میں عرب صاحب نے کئی پھکّے چرونجی کے مارے بیچارے بنئے نے صبر نہ کر کے کچھ کہا تو اوس کے جواب میں گالی سُنی اور دم بخود ہو کے رہ گیا۔

جب مغفور نے بتدریج انتظام کیا اور ان کا زور توڑا تو مولف کو یہ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ ایک بنیے کو عرب نے سودے میں تکرار کر کے گالی دی تو بنیا بھی جواب دے کر کھڑا ہو گیا۔ عرب صاحب جنبیے پر ہاتھ رکھ کر رہ گئے زیادہ برایں جرات نہ کر سکے۔

اگر کوئی عرب کسی عرب کو قتل کرتا تو اس کا قصاص خود عرب آپ کرتے تھے۔ سرکاری قصاص نہیں ہونے دیتے تھے۔ عربوں کے قصاص کا یہ طریقہ تھا کہ شخص واجب القتل کی مشکیں کس کر ایک درخت سے باندھ دیتے تھے۔ پشت اس کی درخت کی جانب ہوتی تھی۔ دس نفر عرب منجملہ عزیزان مقتول روبرو واجب القتل کے تھوڑے فاصلے پر استادہ ہو کر اپنی اپنی بندوقوں میں گولی کا بار بھرتے اور توڑے سلگا کر رو بجانب واجب القتل مستعد ہو جاتے۔ تب چاوش ان کا مرفعہ چی کو یعنی ٹلی بجانے والے کو حکم دیتا۔ ٹلی پر ایک چوب پڑتی پھر دوسری چوب پھر تیسری چوب کے ساتھ ہی دس بندوقیں ایک دم

اس کے پاؤں سے کیچڑ کا ذرا سا چھینٹا دامن پر محمد صاحب کے آیا۔ ساتھ ہی یا یائے
محمد صاحب بلّم بردار نے بلّم کی نوک سے دستار کو مولوی زادہ موصوف کی زمین پر گرا دیا۔
وہ بیچارہ بکمال غیرت خشمناک ہو کر اپنی تلوار خدمت گار سے لینے کو ہاتھ بڑھایا تھا
کہ ایک نے ان میں سے تلوار مار ہی دی۔ جس سے چار انگلیاں مولوی زادۂ مذکور کی
قلم ہو گئیں۔ پھر تو جملہ ہمراہی ان کے ٹوٹ پڑے کسی نے تلوار ماری کسی نے بھالا
مارا کسی نے کٹار سے کام لیا۔ الحاصل اس مولوی زادے کے ٹکڑے اُڑا دیئے اور
چلے گئے۔ اسی طرح ظلم و تعدی علانیہ کرتے تھے اور سرکار سے کوئی انتظام و انتقام
ظہور میں نہیں آتا تھا۔ اس ناپرسانی کی وجہ سے ان پٹھانوں کی تعدی و بیباکی
ترقی کرنے لگی تا آنکہ بتاریخ سلخ ذیحجہ ۱۲۳۷ھ روز چہارشنبہ یٰسین خاں نامی جمعدار کا
چھوٹا بھائی زبردست خاں ولد دلدار خاں کا جس نے کہ جمعداروں میں اس ریاست
کے خصوصیت حاصل کی تھی بکمال تعصب مسجد واقع جلوخانہ نواب نیر الملک بہادر
میں جو کہ فی الحال میر عالم کی منڈی کہلاتی ہے آکر رئیس العلما مولوی عبدالکریم صاحب
سے جو بالائے منبر مشغول واعظ تھے مباحثہ شروع کیا اور مذہبی گفتگو گستاخانہ الفاظ
کے ساتھ کرنے لگا۔ مولوی صاحب نے ہر چند منع کیا کہ یہ کیا بیہودہ کلامی ہے
مگر وہ باز نہ آیا تا آنکہ مولوی صاحب نے خشمناک ہو کر ایک طمانچہ اس کے مارا۔
اس نے بھی تلوار کھینچ کر حملہ کیا تھا کہ حاضرین مسجد نے اس کو پکڑ لیا اور تلوار اس کی
چھین کر بعد زد و کوب مسجد سے باہر نکال دیا۔ زد و کوب میں ایک زخم خفیف بھی

دبیر پورہ سکونت پذیر ہوئے اور اس مقام کا نام چنچل گوڑہ رکھا۔ بحال پیروی ان میں سے تھوڑے سرکار عالی کے زمرہ سپاہ میں ملازم ہوئے اور تھوڑوں نے تجارت وساہوکاری اختیار کی۔ اس زمانے میں تو یہاں کے اعلیٰ وادنیٰ سب کی گزر بسر قرض کشی پر منحصر تھی۔ بوجہ اشد ضرورت معمولی سود سے چہار چند سود بھی دیتے تھے بناءً علیہ تھوڑی سی مدت میں یہ لوگ نہایت مالدار اور دولت مند ہو گئے۔ اور سرکار عالی میں رسوخ حاصل کر کے بعض صاحب جمعیت وطبل وعلم وصاحب نوبت وجاگیر و معاش ہو کر درجۂ امارت کو پہونچ گئے۔ جب یہ زور حاصل ہو گیا تو معاملات داد و ستد کی یہ نوبت ہوئی کہ جو مدیون وعدے کو وفا نہ کر سکتا یعنی ادائی قرضہ میں دیر کرتا تو اس کو مع اہل وعیال گرفتار کر کے قید شدید میں رکھتے اور اقسام کی تکلیفیں دیتے تھے۔ اس وجہ سے ان پٹھانوں کا خوف مخلوق حیدرآباد کو اس قدر ہو گیا تھا کہ اگر راستے سے کوئی پٹھان گذرتا تھا تو رہگذر کے لوگ باہم بات چیت نہیں کرتے تھے جب تک وہ پٹھان نظر سے غایب نہ ہو جاتا۔ اس فرقہ کی بے باکی وتعدی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ روز وفات والدہ راجہ چندو لعل متوفی قریب مقام چوک کے برادر زادۂ مولوی مرتضیٰ صاحب گھوڑے پر سوار جارہے تھے کہ ادھر سے محمد صاحب ابن سلطان میاں جو پیرزادے فرقہ مہدویہ کے تھے ان کی سواری نہایت دھوم دھام سے آئی بھالدار۔ بلم دار وغیرہ جلو داروں کے ہٹو بڑھو کا شور اور راستہ تنگ لہذا برادر زادۂ مولوی موصوف کا گھوڑا چمکا اور

جو مہدوی قصد داخل ہونے کا کرنا اس کو مارتے تھے عرب لوگ اوپر سے تفنگ اندازی
میں سرگرم تھے۔ لیکن یہ اہل مسجد معدودے چند مخالفان کثیر کا مقابلہ کہاں تک
کر سکتے تھے آخر کار مجبور زخموں میں چور ہو کر شہید ہو گئے۔ افغانان مہدویہ مسجد میں
جا کر مولوی صاحب مظلوم کو جو مصلے پر سر بسجود تھے مانند گوسفند قربانی کے ذبح
کر ڈالا۔ یہ فتنہ انگیزی و خونریزی باعث خرابی قوم مہدویہ کے ہوئی۔ مولوی صاحب
کے قتل ناحق کی خبر سماعت فرما کر اعلیٰحضرت سکندر جاہ بہادر آبدیدہ ہوئے
خاطر اقدس کو نہایت ملال ہوا۔ راجہ چندو لعل بہادر کے نام بکمال قہر و غضب
حکم جاری ہوا کہ فی الفور ایک پلٹن جنگی اور کئی تجربہ کار بہادر مقرر کر کے سرکوبی کے لیے
ان بے ادبان سرکش کی روانہ کریں۔ مہدوی پٹھان انجام کار کو سوچ کر جلو خانہ
مذکور سے بھاگ گئے۔ بعد ازاں حکم اقدس ہوا کہ مجروحین و مقتولین طرفین
ورثائے طرفین کے حوالے کر دئے جائیں پلٹن کے جوان جلو خانہ مذکور کے اطراف جا بجا
حفاظت کے واسطے مسلح و مستعد رہیں۔ اگر بقصد فساد پھر کوئی آئے تو بلا تامل اس کو
گولی ماردی جائے۔ الغرض اس واقعہ حیرت افزا سے اس روز تمام شہر میں
عجیب شور و غوغا تھا اور اس شب کو بہ اندیشۂ ہنگامہ محشر زا کوئی سویا نہیں جب
صبح ہوئی تو صدر الصدور مع بعض امرا و علمائے شہر جمع ہو کر لاشۂ مولوی مظلوم
شہید کو دفن کیا۔ قریب دو پہر دن چڑھے کے چار مینار کے قریب مسجد جامع پر
مسلمانوں کا مجمع کثیر باتفنگ و شمشیر مہدویوں سے انتقام لینے کے واسطے بکمال

اس کے سر میں آیا تھا۔ وہ پٹھان حوض واقع جلوخانہ مذکور پر جاکر بقصد فساد عظیم بیٹھ گیا اور اپنے ہم قوموں کو خبر کی۔ بمجرد خبر ہونے کے پانسو پٹھان مسلح دوڑے ہوئے آئے دروازہ جلوخانۂ مذکور کا دربانوں نے بند کرلیا تھا۔ نواب نیر الملک بہادر اس روز حویلی قدیم سے اپنی حویلی جدید میں اہتمام و انتظام عاشور خانہ کے لئے حسب معمول ہر سال تشریف لے گئے تھے۔ اس ہنگامے کی خبر سن کر فرمایا کہ طرفین کے لوگوں کو بہ نرمی و صلاحیت فہمایش کر کے فساد رفع دفع کردیں۔ مہتاب خاں اور بازخاں کو طلب کر کے تاکید بلیغ کی کہ اپنے ہم قوموں کو سمجھا کر واپس کردو ایسا نہ ہو کہ فساد و جنگ و جدال کی نوبت آئے۔ اس تاکید و اہتمام صلح کے بھروسے پر مصلحوں نے یعنی مہتاب خاں اور بازخاں نے دروازہ کھلا دیا اور حسب الحکم نواب صاحب ممدوح ہر چند سمجھایا اور جنگ و جدل نہ کرنے کے لئے نرمی و صلاحیت سے ہزار فہمایش کی مگر مطلق اثر نہ ہوا اور بمجرد دروازہ کھلنے کے جملہ پٹھان بانیغ و سناں حملہ آور ہوئے یہ خبر نواب صاحب ممدوح کو پہونچی تک مسجد پر جا پڑے۔ اس وقت مسجد میں حسن خاں اور ان کا بھائی دایم خاں مندوزئی۔ امام الدین خاں فرزند اکبر یار جنگ تاج محمد خاں برادر زادہ عزت یار خاں محی الدولہ بہادر۔ چند عرب اور دو تین نمازی جمع تھے۔ اس ہنگامۂ محشر نما کو دیکھ کر اہل مسجد نے جہاد پر کمریں باندھ لیں اور روک ٹوک کرنے لگے۔ لیکن قضا و قدر کو کون روک سکتا ہے۔ خونریزی شروع ہوئی۔ دایم خاں اور ان کا بھائی دروازۂ مسجد کے دو جانب شمشیر بدست بکمال ثابت قدمی کھڑے ہوگئے۔

بہ کمال جوش روانہ ہوئے ان کے پیچھے ہزارہا عوام الناس نا عاقبت شناس آراستہ و پیراستہ بازرین لباس دروازہ یاقوت پورہ پر جو حسب الحکم سرکار مسدود و مقفل ہوا تھا پہنچ کر تھمے اور تقاضا قفل کھولنے کے لئے دربان پر ہونے لگا۔ دربان نے جب نہ کھولا تو بلوائیوں نے قفل کو توڑ کر دروازہ کھولدیا پھر کیا تھا مانند دریائے موجزن کے روانہ ہوئے۔ قریب جنجل گوڑہ کے ایک میدان میں پہنچ کر ٹھہر گئے۔ نیاز بہادر خاں وغیرہ افسران اعلیٰ ترتیب صفوف و انتظام میدان جنگ میں مصروف تھے کہ ایک ٹکڑی سواران مہدویہ کی عقب سے ٹیلے کے جو اس میدان میں واقع تھا نکلی اور بے تحاشہ صالح محمد خاں کے ہمراہیوں پر حملہ کیا۔ تلوار چلنے لگی۔ نیاز بہادر خاں نے جو یہ دیکھا ہاتھی پر سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گئے اور اپنے سواروں کو صالح محمد خاں کی مدد کے لئے روانہ کیا اور شمشیر خاں مہدوی بھانجا شاہ عالم خاں کا اور ممریز خاں نامی مہدوی یہ ہر دو اپنی جوق سے جدا ہو کر نیاز بہادر خاں کے مقابلے پر آ گئے۔ عین زد و ضرب میں تلوار نیاز بہادر خاں کی ٹوٹ گئی اور گھوڑا بھی رہ گیا تا آنکہ پیدل ہو کر داد مردانگی دی اور مقتول ہو گئے۔

افسوس ہے کہ ہمراہیان نیاز بہادر خاں میں سے کسی نے بھی اپنے آقا کی امداد نہ کی۔ براہ نمکحرامی بالکل بے خبر رہے۔ عوام الناس نے جو محض تماشا سمجھ کر آئے تھے۔ دیکھا کہ یہاں جان پر کھیلنا ہے اپنی اپنی تلواریں بغل میں دبائے ہوئے بھاگے

جوش و خروش فراہم ہوا ۔ اعلیٰ و ادنیٰ ملازمت پیشہ تجارت پیشہ اہل حرفہ وغیرہ میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو زیر علم حاضر نہ ہوا ہو ۔ دوکانیں تمام بند ۔ مکانات مردوں سے خالی مستورات کی پریشان حالی ۔ ہر طرف سے شور برپا کہ ہاں چلو تلوار باندھو بندوق لو ۔ اس روز شہر میں ایک قیامت برپا تھی ۔ جمع ہوتے ہوتے شام ہونے آئی ۔ اس ہنگامے کے جو سرخیل تھے ان کی رائے یہ ہوئی کہ آج شام ہوگئی ہے کل اوّل وقت چلیں گے یہ سن کر سب اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوگئے ۔ دوسرے روز جو تیسری ماہ محرم کی ۱۲۳۰ھ جمعہ کا دن تھا پھر صبح سے مکہ مسجد میں بلوائی جمع ہونے لگے اور یہ رائے قرار پائی کہ نماز جمعہ سے فارغ ہوتے ہی روانہ میدان جہاد ہوں ۔ اس عام ہنگامے کے روکنے کے لیے وزیر سلطنت نے اور پیشکار صاحب نے بہت کچھ امتناعی احکام بھیجے نصیحتانہ فہمایش کی مگر بالکل موثر نہ ہوا ۔ جوں جوں عوام الناس شریک مجمع ہوتے گئے اسی قدر جوش بڑھتا گیا ۔ دوبار دربار پیشگاہ **اعلیحضرت** سے بذریعہ معتبرین سلطنت نہایت قدغن کے ساتھ حکم نافذ ہوا کہ اگر کوئی شخص ہمارے حکم کو نہ مان کر ان بلوائیوں کا ساتھ دیگا وہ اپنی جان سے ہاتھ دھوئے ۔ باوجود اس کے بعض معززین مانند نیاز بہادر خان بہادر ۔ منصور خان ۔ صالح محمد خان کیقباد جنگ بہادر ۔ برادر رفعت الملک بہادر اور اکثر سرکاری لوگ اور چند جوق عربوں کے مع چند ضرب توپ مکہ مسجد میں آئے اور تین پہر کے قریب مولوی شجاع الدین اور اولیا صاحب کو جو کہ بانی مبانی اس بلوائے عام کے تھے ہمراہ لے کر مانند دریا کے

اس فرقہ کے چار شخص چارسو کے حوض کے پاس آکر کھڑے رہے ۔ سواری محی الدولہ
عزت یار خاں صدر الصدور کی جب آئی ۔ چونکہ صدر الصدور طبیب بھی تھے اس لئے
ان چاروں میں سے ایک شخص نبض دکھانے کے بہانے سے قریب پنس کے گیا ۔
صدر الصدور تلاوت قرآن شریف میں مشغول تھے اور سرراہ سواری چلتی ہوئی
میں نبض دیکھنے کا حالانکہ موقع نہ تھا مگر بکمال اخلاق و انسانیت ایک ہاتھ میں
قرآن شریف کو تھام کر دوسرے ہاتھ سے نبض دیکھنے لگے ۔ ساتھ ہی اس شخص نے
کٹار سے مارا قرآن شریف صدر الصدور کے خون سے رنگین ہوگیا ۔ اور وہ چاروں
پٹھان عالیجاہ کے کوٹلے کی جانب برہنہ تلواریں لیے ہوئے بھاگے ۔ اس وقت
پولیس ایسی کہاں تھی جو پرساں ہوتی مگر صدر الصدور کا خدمتگار پکارتا ہوا پیچھے
ان کے دوڑا کہ یہ جانے نہ پائیں صدر الصدور کو مار کر جا رہے ہیں ۔ اتفاقاً اس وقت
مبارز الدولہ بہادر بالاخانے پر برآمد تھے اُن کے حکم سے ایک منصبدار زادہ
دوڑ کر حایل ہوا اور ان میں کے تین شخصوں کو مارلیا باقی ایک نکل گیا ۔

واضح ہو کہ تخلیۂ چپل گوڑہ اور واقعہ اخراج کے بعد یہ لوگ لال گڑی وغیرہ
مقامات پر چند سال باہر رہے بعد ازاں بتدریج پھر آگئے ۔ اور حسب بیان ہدیۂ عہدیہ
مذکور مہاراجہ بہادر کو نذرانے دینے سے ان کی جمعداریاں اور اکثر جائدادیں رفتہ رفتہ
پھر بحال ہوگئیں اور صاحب ثروت ہوگئے ۔

بزمانۂ مدار المہامی مغفور اوّل بھی اس فرقہ سے اور ایک واقعہ ظہور میں آیا ۔

چند بہادر اشخاص مع عربوں کے سرگرم جنگ تھے منصور خاں ایک سمت توپ سے
کام لے رہے تھے کہ دفعتاً چند مہدوی منصور خاں پر جا پڑے۔منصور خاں مع خواہر زادہ
زخموں میں چور گر گئے۔ مہدوی موقع پاکر توپ اٹھا لے گئے۔سید نصرت خواہرزادہ
ان کا تھا اور داروغگی ہر کار ہائے حضوری حاصل کی تھی۔نیز روشن خاں وغیرہ اکثر
نامور اُن میں کے قریب تین سو اسم کے مارے گئے۔ادھر کے بھی ایک سو پچاس آدمی
کے قریب مقتول و مجروح ہوئے۔چونکہ شام ہوگئی تھی مجمع قتال پریشان اور
ہر ایک اپنے اپنے مسکن کی جانب رواں ہوا۔جب یہ خبر جسارت و سرکشی فرقہ
مہدویہ کی سمع اقدس اعلیٰحضرت میں پہنچی تو بکمال قہر و غضب حکم جاری فرمایا کہ
رات ہی کو انگریزی فوج مع توپخانہ جو ہمارے علاقہ کی ہے ان گستاخوں کے استیصال
کے لئے جائے چنانچہ دوسرے روز صبح کو حسب الحکم اقدس انگریزی فوج نے آکر
چنچل گوڑہ کو گھیر لیا اور منتظر حکم کے تھے کہ شاہ عالم خاں وغیرہ معززان مہدویہ
نہایت عاجزی و منت کے ساتھ ملتجی ہوئے کہ دو تین روز کی مہلت ملی تو ہم سب
مع عیال و اطفال و اثاث البیت یہاں سے چلے جاتے ہیں۔امان خواہ کو امان دینی
شیوۂ اسلام ہے اس لئے دو روز کی مہلت دی گئی۔اس مہلت میں جملہ مہدوی
پٹھان اپنا اثاث البیت وغیرہ اٹھا لے گئے۔کوئی شخص ان میں سے بمقام چنچل گوڑہ
نہ رہا۔ ختم ہوا ترجمہ کتاب لالہ برجنا تھ۔
ہدیہ مہدویہ میں مندرج ہے کہ چنچل گوڑے سے اخراج ہونے کے بعد ایک روز

ایک واقعہ یہ کہ ایک روز دو مصنوعی دو لھے بناکر بہ بہانۂ نذر دہی خدمت میں بہادر ممدوح کی لائے۔ نذر دینے کے لئے جھکتے ہی مصنوعی دولھے بہادر ممدوح کے شکم میں کٹار لگانے پر تھے مگر فتح علی خانساماں بہادر ممدوح کا مشہور جاں نثار جو ہمہ وقت حاضر رہتا تھا اور اس کی نظر شمع جمال بہادر ممدوح کے اطراف مانند پروانے کے پھرتی رہتی تھی اپنے آقا پر کب آنچ آنے دیتا تھا فی الفور بیچ میں گر پڑا بہادر ممدوح بچ کر ایک طرف ہو گئے اور مصنوعی دولھوں کو مع ہمراہیوں کے جاں نثاران بہادر ممدوح نے عروس مرگ سے ہم آغوش کر دیا۔ ان کی تائید پر اور ایک دو پٹھان زینے چڑھ کر بالاخانہ پر آرہے تھے ان کو غالب جنگ نے جو ہنوز غالب جنگ نہ ہوئے تھے تپنچے سے مار کر گرادیا۔ دیوان خانہ و جلو خانہ میں جو ان کے اور ساتھ والے تھے ان کو عربوں نے دیکھ لیا۔

دوسرا واقعہ یہ کہ سمت سرور نگر سیدا باغ میں مدار المہام موصوف کی سواری اتری تھی۔ دفعتًا خبر آئی کہ مطالبہ تنخواہ کے واسطے کئی جوق پٹھان بہدو مسلح بقصد فساد باہر باغ کے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان میں کا ایک جمعدار جنید خاں نام جو ہمراہی مدار المہام موصوف میں تھا۔ باہر جاکر اپنی قوم کو بہت کچھ سمجھایا جب وہ نہ مانے تو بہادر ممدوح کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اس وقت آپ کی سواری باہر نہ نکلے تو مناسب ہے کہ یہ لوگ آمادۂ فساد ہیں۔ بہادر ممدوح نے کچھ پروا نہ کر کے حکم سواری کا دیا۔ تا آنکہ جلوس سواری آگے بڑھا اور خاص بوچھا سواری بہادر ممدوح کا

مگراب اس ہنگامہ وخونریزی زمانہ سابق کی جرات کیونکر ہوسکتی تھی۔ ہاں یہ ہوا کہ اس فرقہ کے عالموں نے مولوی محمد زماں خاں صاحب سے بذریعہ بعض اشخاص مذہبی مباحثے کی بنا ڈالی۔ مولوی صاحب نے ان کے عقائد کی کتابیں انہیں سے حاصل کرکے ان کی تردید کی اور اس کتاب کا نام ہدیہ مہدویہ رکھا جس کا ذکر قبل ازیں آچکا ہے۔

تردید مذکور کی تردید کرنے کے عوض فرقہ مہدویہ کو جوش خونریزی پیدا ہوا مگر یہ زمانہ قانون کا تھا لہذا فقط ایک شخص اس فرقے کا قتل مولوی صاحب پر آمادہ ہوکر آگیا۔ تاکہ حسب شرع وقانون قصاص اسی ایک قاتل کی ذات پر آئے اور فرقہ محفوظ رہے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بتاریخ ۶ ماہ ذیحجہ ۱۲۹۲ھ بعد نماز مغرب مولوی صاحب موصوف مسجد میں تلاوت کلام اللہ میں مصروف تھے کہ ایک مہدوی پٹھان نوجوان عقب سے آکر دفعتاً بمقام گلو وسینہ مولوی صاحب پے درپے کٹار کے دو چار ضرب ایسے لگائے کہ جس سے مولوی صاحب شہید ہو گئے۔ قاتل کو اسی وقت گرفتار کرکے ہر چند پوچھا گیا کہ کس کی ترغیب سے تو نے یہ کام کیا اور تیرے ساتھ کون کون تھے۔ مگر اس نے اپنے قصد ذاتی کے سوائے کسی کا نام نہ بتلایا تاآنکہ قصاص کو پہنچا۔ اور چند علما ان کے جو مناظرے میں شریک تھے اخراج کر دیئے گئے۔ مذہب کے لئے جنگ وجدل کا بیان ہو گیا۔ مطالبۂ تنخواہ کے لئے بھی دو واقعے مشہور ہیں اور وہ ہر دو واقعے سراج الملک بہادر مدار المہام سرکار عالی ہی کے ساتھ وقوع میں آئے ہیں۔

نذر دیتے تھے اور وہیں پاندان انھیں مرحمت ہوتا تھا۔

واضح ہو کہ چنداجی نامبردہ ماہ لقا بائی خطاب طوائف سے تھی اواخر عہد مغفرت منزل و اوایل زمانہ غفران منزل میں اپنے فن میں کامل اور ذی ثروت و مشہور تھی۔ شاعرہ صاحب سوادبھی تھی چنانچہ اس کے قلم کی ایک کتاب صدپند نعمان کتب خانہ عالیجناب نواب سالارجنگ بہادر حال میں موجود ہے جس کا سنہ کتابت ۱۲۳۶ھ ہے الحاصل راجہ موصوف کی جاگیر بھوم وغیرہ کی سند کو مولف نے دیکھا ہے۔ ایسی سند اب تک کوئی نظر نہیں آئی یعنی نسلاً بعد نسل وبطناً بعد بطن بحال رہنے کے سوائے دیسکھی اور دیسپانڈیہ وغیرہ جملہ حقوق و رسوم معاف مختصر یہ کہ ایسے کچھ مراحم اور رعاتیں اس سے ہیدا ہیں جیسے کہ کوئی بادشاہ اپنے عزیز ترین عزیز کو لکھہ دیتا ہے۔ اور اس پر شاہان دہلی کے دستخط و علامات طلائی مندرج ہیں۔ اور بار ویرجی مہر ثبت ہے۔ راجہ موصوف دربار شہنشاہ دہلی کے امرامیں سے تھے جو برفاقت مغفرت مآب متعین ہو کر یہاں آئے تھے۔ اگر ان کے فرزند عیاشیوں میں آپ کو تباہ نہ کر لیتے تو وہی عزت و ثروت اب تک ان کی اولاد میں باقی رہتی۔

اسی طرح بسا دولتمند بدولت عیاشی ومصرفی تباہ ہوگئے ہیں۔ قدیمی ہم محلگی کے سبب سے مولف واقف ہے کہ علاوہ ہنود کے راجہ موصوف کی مسلمان اولادمیں جمیع مذاہب کے حضرات گزرے اور بعض موجود ہیں یعنی سنی۔ شیعہ۔ مشایخ۔ فقیر وہابی وغیرہ۔

باغ کے پھاٹک سے نصف باہر ہوا تھا یعنے آگے کے کہار باہر نکلے تھے اور پیچھے کے ہنوز پھاٹک کے اندر تھے کہ پٹھانوں نے بندوقیں سر کیں جس سے چند ہمراہی مجروح و مقتول ہوئے اور ایک موٹا چھرا بوچہ کے آئینے کو توڑکر رخسار بہادر ممدوح میں قریب نرمہ گوش بیٹھا۔ بمجرد اس کے عربوں کی بندوقوں سے اکثر پٹھان مقتول ہوئے باقی نکل گئے۔

لیکن اس فرقے کی اب وہ جہالت نہیں رہی ہے۔ زمانے کی تہذیب نے انھیں مہذب و معقول کر دیا ہے۔ چنانچہ صاحب سواد ہوکر اہل قلم میں شریک ہوتے جاتے ہیں ان لوگوں کی نہ وہ اگلی وضع رہی ہے نہ وہ طبایع ہیں۔

راجہ راؤ رنبھا جیونت بہادر حال کے سردادا راجہ رنبھا نبال کر کلاں بہ سبب عیاشی مبتلائے قرضۂ کثیر ہوکر تباہ ہو گئے تھے۔ ان کے خاندانی کبیر السن اشخاص سے معلوم ہوا ہے کہ اسی زمانے میں مطالبہ رقم قرضہ و تنخواہ کے لئے مہدوی پٹھانوں نے سخت دنگا کیا تھا جس کے سبب سے ہتھیار چلا۔ راجہ کلاں موصوف کے دو فرزند مسلمان یعنی صفدر الدولہ و رستم الدولہ مرحومین اس روز خوب لڑے اور کمال مردانگی دکھلائی۔ لچھمن لعل نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ان کی جاگیرات کو قرضے میں پھنسا ہوا دیکھ کر مہاراجہ چندو لعل نے قرضہ کا تصفیہ کر دیا اور ان کی جاگیرات کو ضبط کر لیا۔ الخ لاکھوں روپے کی معاش اور جملہ ثروت صرف عیاشی و نذر چندا جی ہوگئی ورنہ ان کی عزت اس سلطنت میں مشہور تھی کہ ان کے جدّ اعلیٰ رئیس کی عماری سے عماری ملا کر

قزاقی و خونریزی نہایت بڑھ گئی تھی۔ ان کی اور عربوں کی بنتی نہ تھی۔ اکثر باہم خونریزیاں ہوئی ہیں۔ سوائے بلدے کے تعلقات و جاگیرات میں زیادہ تر اس فرقے نے یعنی رہیلوں نے غارت گری مچائی تھی۔ ساہوکار وغیرہ جس کسی رعیت کو مالدار پاتے تھے اس کے گھر ڈاکا مارتے تھے۔ رہزنوں کی وجہ سے راستے بے امن تھے۔ اس فرقے کے ہم پیشہ مرہٹواڑی اور کنٹروغیرہ کے ڈکیت بھی مثل قوم بھیل۔ کیکاڑی۔ مانگ۔ سکھ۔ لمباڑے۔ گونڈ۔ ٹکرو غیرہ ان میں شامل ہو گئے تھے۔ بعض سرکش زمیندار و تعلقدار رہیلوں کی جمعیت بمقابلہ سرکار یا جاگیردار بھرتی کرتے تھے۔ اکثر زمیندار اور رہیلے گڑھیوں پر اور قلعوں پر قابض ہو گئے تھے۔ جس زمیندار یا تعلقدار کو کسی جاگیر یا تعلقہ پر قبضہ کرنا منظور ہوتا تھا تو رہیلوں کی جمعیت نوکر رکھ لیتے تھے۔ اور فی الفور چڑھائی کرتے تھے جس میں اکثر کشت و خون ہوتا تھا۔

رہیلوں کو زر کے ساتھ سچا عشق ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ رہیلے نوکر رہ کر اسی وقت لڑائی اور غارت گری پر روانہ کر دیئے گئے ہیں اور وہ وہاں لڑ کر مارے گئے حالانکہ ماہوار وغیرہ کا ایک پیسہ بھی نہ پایا فقط زر کے نام پر جانیں دے دیں۔

تجارت پیشہ وغیرہ لوگ اپنی رقم قرضہ عربوں اور رہیلوں کے ذریعہ سے بہ سختی خاطر خواہ وصول کر لیتے تھے۔ عرب یا افغان قرض خواہ ہوتا تھا تو قرضہ ادا نہ کرنے کی حالت میں قرض دار کے سر پر پتھر دے کر کھڑا کرتا تھا اور لوہے کو

عہد مہاراجہ چیند ولعل میں سکھوں کا بھی زور بڑھ گیا تھا چنانچہ مطالبۂ تنخواہ کے لئے سکھ لوگ ایک روز دولت خانہ حضور پرنور پر دنگا بیٹھے تھے۔ نیز رشید الدین خانی میں مرقوم ہے کہ سکھ لوگ ۱۲۵۹ھ میں کارواں کے دوساہوکاروں کو اثنا راہ میں سے پکڑ لے گئے کہ جب تک سرکار ہماری تنخواہ نہ دے گی ہم ان کو نہ چھوڑیں گے۔ سرکاری جمعیت بھیجی گئی لیکن کچھ نہ ہوا۔ بلکہ سکھوں کی بستی کے قریب جو میر عالم مرحوم کا تالاب ہے اس کا بند توڑ کر جمعیت سرکاری کو بہا دینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ تاآنکہ کئی روز کی فہمائش کے بعد سرکار عالی نے چھیانوے ہزار روپے نقد دے کر ساہوکاروں کو رہائی دلائی۔ قدیم لوگوں کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوا ہے اور اب تک مشہور ہے کہ بلٹن والے بھی اس زمانے میں مطالبہ تنخواہ کے لئے بارگاہ شاہی پر دنگا بیٹھا کرتے تھے مرقعہ عبرت سے ظاہر ہے کہ اسی زمانے میں پٹھان لوگ بھی بارگاہ شاہی میں مطالبہ تنخواہ کے واسطے حالانکہ بے اصل تھا متمردانہ درائے تھے جن میں جہانگیر خاں بدمعاش بھی شریک تھا۔ وہی جہانگیر خاں جس نے دربار میں قرابین سر کی تھی اور اس کا بیان موقع پر آئے گا۔

نیز قرض خواہ وغیرہ اہل رسالہ خاص بھی دنگا بیٹھے تھے چنانچہ قلندر بیگ کو گرفتار کرنے کا جب حکم ہوا تو قلندر بیگ لڑکر بارگاہ شاہی میں جلوخانہ خوابگاہ کی طرف مقتول ہوا۔ اور کئی سپاہی سرکاری مجروح و مقتول ہوئے۔ اسی زمانے میں رہیلوں کی

باہر ندی کے کنارے واقع ہے۔ اسی طرح اکثر مقامات پر ہنگامے برپا تھے۔
رستم الدولہ مقتول موصوف کے فرزند واحد علی خاں کو نواب صاحب مغفور نے عہدۂ مہتممی پولیس اضلاع سے سرفراز فرمایا تھا۔ واحد علی خاں مرحوم کے دو فرزند موجود ہیں ایک پرورش علی خاں دوسرے ریاست علی خاں سرکار عالی میں منصب پاتے ہیں۔
تعلقات میں پولیس نہ تھی۔ بلدے میں کوتوالی تھی مگر کمزور و ناکافی۔ نہ آسیے جا بجا تھانے تھے نہ اس قدر جمعیت تھی۔ تمام بلدے میں چند چاوڑیاں یعنی تھانے تھے۔ ہر چاوڑی میں چار پانچ قلیل ماہوار کے جوان ہوتے جن میں بوڑھے بھی ملازم تھے۔ وہ بھی برابر حاضر نہ رہتے تھے۔ بعض جوان چاوڑی میں پکا کر کھاتے تھے ان کا عہدہ دار نایک یا امین کہلاتا تھا۔ جب اس کی طبیعت چاہتی چاوڑی میں آتا تھا۔ ڈر بس تو کسی کو بھی نہ تھا۔ چاوڑی کے ایک ستون کو چند لٹھیں باندھے ہوئے رکھتے تھے۔ دو تین بیڑیاں لوہے کی آویزاں رہتیں۔ بڑی چاوڑی میں گشت یعنی رون پھرنے کے لئے ایک دہیڑ اور سینگہ رہتا تھا۔ نصف شب کے بعد گشت نکلتی تھی اس صورت سے کہ چند جوان ان کے ساتھ دہیڑا اور سینگہ بجانے والے ہوتے تھے اور شاہراہوں پر گزرتے تھے۔ دہیڑا اور سینگہ بجانے کا یہ طریقہ کہ ایک دم سے یہاں بجا دیا اور ساکت ہوگئے۔ تھوڑی دور جا کر پھر ایک دم سے ڈھپ ڈھپ بجایا اور ساکت۔ اسی طرح کہیں کہیں بجاتے ہوئے شہر پناہ کے

گرم کرکے چرکے دیتا تھا جس شخص پر رہزنی وغیرہ کا شبہ ہوتا تو اس کو گرفتار کر لیتے تھے اور بغیر تحقیقات و ثبوت کے قید رکھتے تھے۔ جب وہ کچھ رقم دیتا تھا تو اس کو چھوڑ بھی دیتے تھے۔ اقسام کے ظلم اور چوریاں ہر روز ہوتی تھیں۔ بعض عملدار ضلع کے ساتھ کچھ رقم نامی ڈاکوؤں کو دیتے تھے تو ان کے تعلقات ڈکیتیوں سے کسی قدر محفوظ رہتے تھے۔

اگر شاذ و نادر کوئی ڈاکو گرفتار ہو جاتا تھا اور لوٹ کا مال اس کے پاس سے ہاتھ آجاتا تو سرکاری جمعیت اس کی مالک ہو جاتی تھی۔ اصل مالک کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ کیونکہ سرکاری سپاہیوں کی تنخواہ تین چار روپے ماہانہ سے زیادہ نہ تھی وہ بھی دس بارہ بارہ مہینے تک برآمد نہ ہوتی تھی۔ پس وہ بھوکے بیچارے لوٹ کا مال ہاتھ آنے پر صبر کیونکر کر سکتے تھے الغرض ایسی بہت سی خرابیاں تھیں۔ چنانچہ ۱۲۶۷ھ میں بمقام ملکھیڑ ضلع گلبرگہ قزاقوں نے غارت گری مچائی تھی تو منجانب سرکار عالی راجہ راو رنبھا منوفی کلاں کے فرزند رستم الدولہ بہادر سرکردۂ فوج ہوکران کی سرکوبی کے لئے بھیجے گئے تھے۔ اور وہ بکمال عزم و جرات وہاں پہنچ کر مستعد سرکوبی تھے اور کثرت قزاقان و قلت فوج سرکاری کی وجہ سے برائے امداد سرکار عالی میں معروضہ روانہ کیا تھا۔ لیکن صدر سے امداد بھیجنے میں تاخیر ہوئی تاآنکہ موقع پاکر قزاقوں نے شبخون مارا جس میں رستم الدولہ بہادر مقتول ہو گئے اور بہت سے سپاہی سرکاری مارے گئے۔ بہادر مقتول مزبور کا مزار سیڑم کے

ویسا اس کو اندر نہ پایا۔ جب ہم چار مینار کے پاس پہونچے تو گھوڑوں سے اتر کر سیڑھیوں پر چڑھے اور اس کے چبوترے پر گئے۔ چار مینار کے نیچے کا حصہ نہایت شکستہ حالت میں تھا اور اس میں چھوٹی چھوٹی جھوپڑیاں اور کپڑے کے پال تنے ہوئے تھے جن میں کونجڑے اور حلوائی کی دوکانیں تھیں۔ المختصر وہاں میرے باپ نے ایک دلال موہن داس نام کو پیدا کیا اور اس کی معرفت ایک سوداگر سے ہم جا ملے اور جملہ سامان پارچہ زرین و جواہر وغیرہ مذکورہم نے تیس ہزار چھ سو روپے کو فروخت کر دیا۔ جب میں اور دلال مذکور ہردو رقم لانے کو چلے تو دلال نے راہ میں مجھ سے پوچھا کہ آیا یہ روپیہ تمھارا ہے یا کسی اور کا میں نے کہا یہ روپیہ اس کا ہے جس نے تم کو اس کام کے لئے مقرر کیا ہے۔ پھر میں نے اس کے قیافے سے طبیعت کو پہچان کر کمال ہوشیاری سے اس کے دل کا بھید لیا تو اس نے کہا کہ تم ایک بہادر آدمی ہو جو ہندوستان سے اس مالدار سوداگر کے ساتھ آئے ہو۔ تو پھر ہم تم کیوں نہیں اپنے آپ کو مالدار بنا لیتے۔ میں نے پوچھا کس طرح۔ اس نے کہا ماہوکار کے جوان ہمراہ لینے سے انکار کرو اور جن آدمیوں کو میں بتاؤں ان کو لے لو۔ یہاں سے تھوڑی دور پر ایک پہاڑی ہے جہاں میں اپنا چوری کا مال چھپا رکھتا ہوں وہاں پہنچ کر ہم تم روپیہ بانٹ لیں گے۔ میں نے پوچھا وہ جگہ کہاں ہے۔ اس نے کہا اس وقت دن کو وہاں نہیں جانا چاہئے۔ تھوڑی دور تک مجھ کو ساتھ لیجا کر اشارہ سے ایک بڑی پہاڑی اور

دروازے تک وہ گشت پہونچ کر واپس ہوتی تھی۔ کہیں راہ میں یکّا دکّا آدمی نظر آتا تو اس کو ٹوکتے اور پوچھتے تھے کہ کون ہے کہاں جاتا ہے ورنہ پانچ سات آدمی مسلّح اگر مل جاتے تو پوچھنے کی بھی جرات نہ ہوتی۔ چنانچہ اسی زمانے میں سنا گیا تھا کہ روہیلے وغیرہ ڈاکے والے ہرگاہ راہ میں مل گئے ہیں تو گشت والے خود اپنی جانیں بچاکر کسی بھی گوشے میں دب گئے ہیں۔ الغرض کوتوالی کا وجود وعدم یکساں تھا نہ کوتوالی کسی کی خبرگیراں تھی۔ نہ کوئی کوتوالی کا پرساں تھا۔

امیر علی ٹھگ کی سوانح عمری مطبوعہ میں جو واقعات متعلق حیدرآباد مندرج ہیں اُن سے بھی پایا جاتا ہے کہ زمانۂ سابق میں یہاں کا کیا حال تھا چنانچہ اس میں سے چند واقعات بطور اختصار و خلاصہ برائے ملاحظہ ناظرین درج ذیل ہیں۔

امیر علی مذکور بیان کرتا ہے کہ جب ہندوستان سے مع ہمراہیان باشتیاق حیدرآباد ہم آئے اور کاروان کی سرا میں پہونچ کر ایک مکان کرائے کا لیا۔ اس میں وہ تمام سامان جو لوٹ مار کر لائے تھے محفوظ مقام پر رکھ دیا۔ میرے باپ نے کہا اگر ہم اپنے مال کو بغیر بازاری بھاؤ جاننے کے دے دیں گے تو علاوہ کافی قیمت نہ ملنے کے لوگوں کو ہماری طرف سے بدگمانی بھی پیدا ہوگی۔ دوسرے روز صبح کو میں اور میرے باپ نے عمدہ کپڑے پہنے اور گھوڑوں پر سوار ہوکر پل سے جو قریب میں واقع تھا گذرے اور دروازے میں شہر کے داخل ہوئے شہر کی راہیں تنگ اور غلیظ تھیں جیسا کہ ہم نے باہر سے دیکھ کر شہر کو خیال کیا تھا

دروازہ مضبوط بند تھا۔ میں اس کے پیچھے ہی پہنچا اور فانل رومال اس کی گردن میں
ڈالا۔ اس نے پھر کر میری طرف گھورا اور ایک لحظے کے بعد اس کا مردہ میرے پاؤں
پر پڑا تھا۔ اس کے بعد بھدری ناتھ کے پاس میں گیا جو ہمارے ساتھ کا جمعدار
ٹھگ تھا اور اس سے میں نے دلال کی ساری سرگزشت کہہ سنائی اور دلال مذکور
کی بتلائی ہوئی پہاڑی پر چلنے کا سامان کیا۔ بھدری ناتھ نے ایک شیخ جی نامی ٹھگ
کو جو فقیروں کا بھیس بنانے میں مشاق تھا پہلے پہاڑی پر کیفیت معلوم کرنے کو
روانہ کیا اس عرصے میں ہمارا ہم پیشہ سرفراز خاں آیا اور کہا ہمارا کام توکل شب کا
خوب تھا اور اچھی لوٹ ہاتھ آئی ہے۔ ہم ان لوگوں کو مچھلی بندر کی سڑک سے
لے چلے اور سرورنگر کے اس طرف ایک مقام پر ان کو مار ڈالا اور ان کے لاشوں کو
ایک کنوئیں میں ڈال دیا اور دوسرے راستے سے واپس آئے۔

سبحان اللہ حیدرآباد ایک نادر جگہ ہے جہاں ہم بلا خوف و خطر رہ سکتے
ہیں اور ہر روز یہاں ایک تازہ شکار ہاتھ آتا ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہاں
ہم کو زیادہ ٹھہرنا چاہئے۔ ان باتوں میں ہم مصروف تھے کہ شام ہو گئی اور شیخ جی
جاسوس نے آکر کہا میں اس مقام پر جا کر فقیر کو بیٹھا ہوا دیکھا۔ اس نے مجھ کو نیچے
اتر جانے کے لئے دھمکایا لیکن جب میں نے اس سے کہا کہ میں بہت بھوکا پیاسا مسافر
ہوں خدا کے واسطے ایک ٹکڑا روٹی کا اور دو گھونٹ پانی دو۔ یہ سن کر ذرا نرم ہوا
اور مجھ کو کچھ کھانا دیا تو میں نے اپنی افیون کی ڈبیا نکال کر ذرا سی کھالی۔ یہ دیکھ کر

پتھروں کی چٹانیں بتائی جو کاروان وبیگم بازار کے پیچھے واقع تھی۔ اور کہا یہ وہی مقام ہے اس کو سوا میرے اور دوسرے چند آدمیوں کے کوئی نہیں جانتا ہے ہم کل سولھا ۱۶ آدمی ہیں ان میں سے ایک تو فقیر کا بھیس بنائے بیٹھا ہے۔ یہ سن کر میں اس کو ڈانٹا اور کہا او کتّے تو کس سے یہ کہہ رہا ہے مجھ کو کیا سمجھا ہے ناحق تضیع اوقات کی تو نے اب تک تو ہم اپنے مکان پر واپس ہو جاتے۔ چل ملعون مجھ کو ساہو کار کے پاس لے چل۔ بخدا تیرا اعتبار نہ رہا۔ اس نے گھبرا کر کہا نہیں اس معاملہ میں تو میں نے ایمانداری کی ہے روپیہ سے تو آپ مطمئن رہیں۔ بعد ازاں جلد ہم اس ساہو کار کے مکان پر پہنچے جو ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ پھر میں نے تمام روپیہ لے کر ساہو کار کے جوانوں کے ہمراہ اپنے باپ کے پاس روانہ ہوا۔ جب ہم اپنے قیام گاہ کے قریب پہونچے تو دلال نے مجھ سے کہا۔ میر صاحب جو کچھ گزرا اس کو بھول جائیے بھگوان جانتا ہے میں آپ سے دل لگی کرتا تھا۔ جب تمام روپیہ ہمارے مکان میں پہونچ گیا تب ہم نے سپاہیوں کو کسی قدر انعام دے کر روانہ کر دیا۔ میرے باپ نے ایکسو پچاس روپے حق دلالی دلال کے حوالے کئے۔ وہ لے کر جانے کو تھا کہ میں نے اپنے باپ سے وہ سب باتیں کہہ دیں جو دلال نے مجھ سے کی تھیں۔ یہ سن کر میرا باپ دلال سے بولا کیوں حرامزادے کیا تو ہمیں کو لوٹنا چاہتا تھا۔ اس وقت خوف کے مارے دلال کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ بعد ازاں دروازے کی طرف بے تحاشا بھاگا

نگرانی کر رہے تھے بھاگ کر آئے اور دو آدمیوں کے آنے کی خبر دی ۔ ہم سب نہایت پھرتی سے باہر نکل آئے ۔ پھر میں نے کہا چراغ بجھا دو اور تم لوگ اس غار کے اطراف چھپ جاؤ ۔ ہم لوگ چھپ چکے تھے اور اپنے رومالوں کو تیار کر لیا تھا کہ وہ دونوں آدمی پہنچے اور اپنے بوجھ زمین پر پٹکے ۔ ان میں سے ایک نے کہا ۔ کہاں ہے وہ نشہ باز حرامزادہ ہمارے لئے چراغ تک نہ جلایا ۔ یہ فقرہ کو گالیاں دیتا ہوا اندر آیا ۔ میں اور سرفراز خاں نے اس کو مار لیا ۔ لیکن دوسرا آدمی جو باہر تھا کشمکش کی آواز سن کر بھاگنے میں اس کو ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل گرا ۔ اس کے گرتے ہی ہمارے ایک آدمی نے چٹان کے پیچھے سے دوڑ کر اس کو مار لیا ۔ میں نے کہا بس کافی ہے اب چلیں ۔ پھر ہم اس غار میں گھسے اور ایک ایک نے ایک ایک گٹھڑی اٹھائی اور باہر آئے اور سرا کی طرف روانہ ہوئے ۔ تمام اسباب اور مختلف سامان جو ہم لوٹ لائے تھے اور یہاں لوٹا تھا وہ سب پہنچنے سے کل رقم پچاس ہزار روپے کے قریب جمع ہو گئی تھی ۔ میرے باپ نے اب شہر سے روانہ ہونے کی نسبت گفتگو کی ۔ میں نے اور دس روز ٹھہرنے کے لئے اجازت مانگی کیونکہ میں نے باتفاق رائے بھدری ناتھ و سرفراز خاں یہ تجویز قرار دی تھی کہ ہمارے گروہ کے سب آدمی چار جماعتوں میں تقسیم کیے جائیں اور شہر کی چاروں طرف علٰحدہ علٰحدہ مقاموں پر جا کر رہیں اور اپنا اپنا کام کریں اور جو کچھ مال ہاتھ آئے وہ ایک جا جمع کیا جائے ۔ چنانچہ اسی دن سے تعمیل شروع ہوئی ۔ میرے حلہ کے تالاب کے قریب

اس لے بھی تھوڑی افیون مانگی اور ایسا بڑا گوٹا اُڑایا ہے کہ صبح تک نشے سے بیدار نہ ہوگا۔ یہ سن کر ہم سب چلے۔ جب اس غار کے پاس پہنچے تو شیخ جی نے کان میں آہستہ سے کہا دیکھو وہ اب تک چراغ کے سامنے سو رہا ہے پاؤں آہستہ اٹھاؤ شاید چونک پڑے۔ قریب پہنچ کر میں نے بھدری ناتھ سے کہا وہ سو رہا ہے میں اس کی گردن میں کیسے رومال ڈالوں۔ یہ سن کر بھدری ناتھ نے فقیر کے معدہ پر اپنی تلوار کے قبضے سے ایک سخت صدمہ پہنچایا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا میرا رومال تیار تھا ایک دم میں وہ فقیر مر گیا۔ میں نے پھر چراغ کو تیز کر کے دیکھا تو غار کے ایک کونے میں مٹی کے گھڑے اور مرتبان تلے اوپر رکھے تھے ان میں سے دو پہلے گھڑوں کو اٹھا کر دیکھا تو چاول اور دال بھری ہوئی تھی مگر تیسرے مٹکے میں روپے اور پیسے ملے ہوئے تھے اور سب سے آخری مٹکا تو سب سے عمدہ تھا اس میں سونے چاندی کا زیور انگوٹھیاں پازیب اور بازو بند منہ تک بھرے تھے۔ پھر ہم جابجا دوسرے پوشیدہ مقاموں کو تلاش کر رہے تھے کہ دو چٹانوں کے بیچ میں ایک تنگ و تاریک درہ نظر آیا میں اس غار میں چراغ لے کر گیا۔ وہ جگہ بنڈلوں سے اور گٹھریوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک گٹھری کو کھولا جس میں پکانے کے برتن اور ظروف کھچا کھچ بھرے تھے اور کچھ سونے چاندی کو اس میں پانے سے میں خوش ہو ہی رہا تھا کہ اتنے میں ہمارے گروہ کے آدمی جو پہاڑی کی نگرانی کر رہے تھے بھاگ کر آئے اور دو آدمیوں نے جو پہاڑی

پہچان لیا۔

الغرض ایک گارڈ کی حراست میں ان سب کو شہر کی طرف لے گئے ہیں۔ یہ سن کر میں نے کہا اب ان غریبوں کی رہائی کرنی چاہئے۔ پھر میں شہر میں جاکر کوتوال کا مکان دیکھا ایک لانبی تنگ گلی میں واقع تھا اور یہ گلی میرے مطلب کے لئے خوب تھی اور کوتوال صاحب دو گھڑی رات گئے دربار کرتے ہیں یہ معلوم کر کے اپنے قیام گاہ کو واپس آیا۔ شام کو میں اور چھ آدمی شہر میں گئے اور منتفرق ہوگئے مگر ایک دوسرے کو نظر میں رکھتے ہوئے چلتا تھا۔ کوتوال کی گلی پر پہنچ کر ہم کچھ وقت تک ادھر ادھر ٹہلتے رہے اتنے میں ہمت خاں میرے پاس آیا اور کہا وہ آرہے ہیں۔ میں نے پوچھا کون ان کے محافظ ہیں تو کہا وہ لین والے تقریباً بیس جوان پرانی بندوقیں لیے ہوئے ہیں ایسے تو ہم سکیڑوں کو کاٹ کر دھردیں گے۔ یہ سن کر ہم سب مستعد اور گلی میں اکٹھے ہوگئے۔ جب وہ قیدی ہمارے قریب پہنچے تو اس وقت میں نے چلا کر کہا۔ بھائی پان لاؤ۔ یہ اشارہ تھا یہ اشارے کے ہوتے ہی ہماری تلواریں میانوں سے نکل گئیں اور ہم نے سپاہیوں پر اکبارگی حملہ کیا۔ دو آدمی مرکر گرے۔ میں قیدیوں کے پاس دوڑا اور اپنی تلوار سے ان کی رسی کاٹ دی جو قیدیوں کے بازو میں بندھی ہوئی تھی۔ ہمت خاں کے بیان کے موافق وہ سپاہی قیدیوں کے ہمراہی بمجرد حملے کے بھاگ گئے۔ الغرض ایک لحظہ میں ہم سب منتشر و متفرق ہوکر اپنے اپنے مقام پر پہونچ گئے۔ (ختم ہوا بیان امیر علی ٹھگ)

جو محلہ تھا میں وہاں جاکر ٹھہرا۔ بھدری ناتھ اور اس کی جماعت چادر گھاٹ کے
بازار میں رزیڈنسی کے نزدیک جاکر اتری۔ سرفراز خاں بدستور آٹھ آدمیوں کے
ساتھ کاروان میں رہا۔ چوتھی ایک بڑی جماعت پیر خاں اور موتی رام کے ماتحت
ہوکر شہر کی مغربی سڑک شمس آباد کی طرف جاکر ٹھہری۔ ہماری اس تجویز میں تعجب انگیز
کامیابی ہوئی۔ کوئی دن خالی نہیں جاتا تھا جس میں ہماری جماعتیں ہم کو ہلاکت کی
خبر نہ پہنچاتی ہوں۔ مگر ان وارداتوں میں ہم کو بکثرت غنیمت ہاتھ آئی تھی۔ یہ
کارروائی شروع ہونے کے آٹھویں دن صبح کو بھدری ناتھ نہایت پریشان میرے
پاس آیا اور کہا کل شام کو سرفراز خاں نے دو ساہوکاروں کو جو دوسرے روز صبح
کو اورنگ آباد روانہ ہونے والے تھے کہہ سن کر اپنے ساتھ سرا میں اوتارا تھا مگر
ان کے چند دوستوں نے آکر کہا ایک ہفتہ شہر میں ٹھہرو تو ہم بھی چلتے ہیں۔ اس
بات سے سرفراز خاں بے قرار ہوگیا اور ان کے دوست جاتے ہی ساہوکاروں کو
فوراً مار ڈالا اور ان کا اسباب لے لیا۔ مگر ان ساہوکاروں کے دوستوں میں سے
پھر ایک آدمی جلدی سے کوئی پیام لے کر سرا میں آیا تو سرفراز خاں نے کہا کہ وہ
ساہوکار باہر کہیں گئے ہیں۔ وہ آدمی بہت دیر تک انتظار کرتا رہا آخر کار اس کو
کچھ شبہ پیدا ہوا تو جاکر دوسرے آدمیوں کو ہمراہ لایا اور انھوں نے اپنے دوستوں
کی تلاش میں اصرار کیا۔ سرفراز خاں نے مقتولوں کی لاشوں کو تو سرا میں گاڑ دیا تھا۔
لیکن ان کا کچھ زیور سرفراز خاں کے جسم پر ملا جس کو مقتولوں کے دوستوں نے

تفتیش و تحقیق کی تو وہ ایکا چونکہ شریفوں کا لحاظ بہت رکھتے تھے اور اس زمانے میں لازمتر بھی یہی تھا۔ ایک واقعہ اس زمانے کے بعض ثقہ حضرات سے مولف نے سنا ہے کہ اندرون دروازہ چادر گھاٹ نواب میر رضا علی خاں نام خاندان رکن الدولہ مرحوم سے رہتے تھے۔ نہایت معقول و ذی استعداد اور بنوٹ میں یعنی فن شمشیر میں کامل و شاگرد رشید حضرت محمد مراد علی شاہ چشتی نور اللہ مضجعہ کے تھے۔ حضرت موصوف بنوٹ کے فن شریف میں مشہور آفاق و یکتائے روزگار تھے اور سوائے شرفازادوں کے کسی غیر شریف کو اگرچہ دولتمند ہوتا شاگرد نہ کرتے تھے چنانچہ یہ لحاظ ان کے قایم مقاموں کو بھی رہا اور ہے۔

رئیس الملک سلیمان جاہ بہادر۔ مبارز الدولہ بہادر۔ مہاراجہ نرندر بہادر۔ شمس الملک بہادر۔ رشید الملک بہادر۔ وغیرہ مرشدزادے اور امرائے عظام اکثر ان کے شاگرد تھے۔ ان کے اوصاف کمال اگر مفصل لکھے جائیں تو ایک رسالہ علیحدہ مرتب ہوگا۔

ان کے فرزند حضرت محمد وزارت علی صاحب منصبدار مرحوم قایمقام و مظہر اپنے والد کے اور مولف کے استاد شفیق تھے۔ باوصف بسا شاگردان لائق ان کی نظر شفقت مولف ناچیز پر زیادہ تھی اور قبل انتقال اپنے جانشین اپنا فن موصوف میں مولف کو فرمایا۔ چنانچہ نواب خانخاناں بہادر نے کہ شاگردوں میں استاد مولف کے اپنے دولت سرا میں جلسہ جانشینی سنہ ۱۳۰۰ھ میں منعقد فرمایا۔ جلسۂ موصوف اور اس کی مفصل کیفیت بیان کرنا موجب تطویل کلام و باعث تفاخر مولفِ گمنام ہے۔

اس سے پیدا ہے کہ کیسی بدنظمی و نا پرسانی کا وہ زمانہ تھا حالانکہ طالب الدولہ سانا مور کوتوال اس وقت تھا۔ ان کا داب و رعب چوروں اور بدمعاشوں پر بہت کچھ تھا۔ سو پچاس یا اس سے کچھ زیادہ غلام حبشی وغیرہ ان کے گھر کے اور دو تین سو ملازم جوان جرات والے رکھے تھے۔ جو کوئی شورہ پشتی و شرارت کرتا یا کہیں ڈکیتیوں کا سراغ لگتا تھا تو ان کی گرفتاری کو یہ جمعیت بھیجی جاتی تھی جس کو طالب الدولہ کی دہونس کہتے تھے۔ لیکن اس قدر قلیل جمعیت سے لاکھوں آدمیوں کا انتظام خاطر خواہ کیونکر ہو سکتا تھا۔ بہرصورت اس زمانے میں بہ نسبت دوسروں کے اچھے تھے۔ ان کا محکمہ اکثر بعد مغرب ہوتا تھا۔ مجرم و مستغیث رات ہی کو پیش ہوتے تھے۔ چوروں کو اپنے ہی روبرو جس قدر مناسب جانتے مار کھلواتے تھے اور اکثر املی کے درخت کی بار یک چھڑیوں سے مجرم کی پشت برہنہ پر مارتے تھے۔ اگر کوئی سخت چور ہوتا تھا اور اقبال چوری کا نہ کرتا تو چھڑیوں سے مارنے کے بعد پشت پر سرخ مرچ کا پانی چھڑکواتے تھے اور مارتے تھے۔ اور مجرموں کو اپنے ہی علاقے کے قید خانے میں جب تک منظور ہوتا قید رکھتے تھے۔

فراست اس پایہ کی ان میں تھی کہ نگاہ ملتے ہی چور کو پہچان لیتے تھے چنانچہ یہ نقل قدیموں سے سنی ہوئی مشہور ہے کہ ایک روز کوتوال موصوف کی سواری واپس آرہی تھی راہ میں ایک شخص اجنبی خوش لباس سے دوچار ہوتے ہی حکم دیا کہ اس کو لے چلو۔ جب اپنے مکان میں پہنچے اور شخص مذکور کو روبرو طلب کرکے

جان و مال سے ہو جاتے تھے۔ جب اس امر کا چرچا ہوا تو جتنے شرفائے محلّہ اور نزدیک و دور کے احباب تھے فی الفور مسلّح ہو کر آ گئے اور خان موصوف سے مل کر یہ رائے قایم کی کہ یہ جوانان کوتوالی جو آپ کو لے جانے آئے ہیں ان سے لڑنا خلاف شان آپ کے ہے۔ بہتر یہ ہے کہ چلیں وہیں جس نے طلب کیا ہے اسی کو دیکھ لیں۔ چنانچہ اسی ارادہ سے چالیس پچاس شرفائے مسلّح خان موصوف سر بکف نکلے۔ جوانان کوتوالی اطراف ہو گئے اور چلے۔ منجملہ احباب خاں موصوف میر روشن علی خاں شاہ سوار مشہور روزگار استاد نواب صاحب مغفور کو جو یہ خبر ملی فی الفور اپنے گھر سے سوار راہ وار ہو کر چشم زدن میں طالب الدولہ کوتوال کے پاس پہنچ گئے۔ چونکہ کوتوال صاحب سے رابطہ قدیم تھا کہا کہ آپ نے یہ کس کو گرفتار کر لانے کا حکم دیا ہے۔ یہ کیا کیا آپ نے میر رضا علی خاں خاندانی رکن الدولہ مرحوم حسب الطلب آپ کے چلے آ رہے ہیں اور ہمراہ ان کے بہت سے شرفا مسلّح ہیں۔ برائے خدا اپنے سپاہیوں کو واپس طلب کر لو۔ یہ سن کر کوتوال صاحب نے ہرکاروں کو اشارہ کیا ہرکاروں نے کوتوالی کے جوانوں کو آگاہ کرتے ہی سب علٰحدہ ہو کر غائب ہو گئے۔ جب چار مینار کے پاس پہنچے اور کوتوالی والوں کا گرد و پیش پتہ نہ رہا تو خان موصوف سے رفقا نے کہا کہ اب چلنا مناسب نہیں کیونکہ اگر کوتوال کہے کہ میں نے آپ کو طلب نہیں کیا تو اس وقت آپ کیا کہیں گے۔ بہرحال فہمائش کر کے خان موصوف کو واپس لائے۔ اس کے دوسرے روز کوتوال طالب الدولہ بہادر

لیکن بعض بزرگان و احباب کا اصرار ہے کہ جب شرفائے زمانہ حال بغیر کسی
ممانعت کے از خود ترک شمشیر کیئے جا رہے ہیں تو فن شمشیر کی قدر کب باقی رہے گی۔
اور جب قدر نہ ہوگی تو نہ کوئی استاد ہوگا نہ کسی کو اپنا جانشین کرے گا۔ لہذا
جلسہ جانشینی متذکرہ کی تصویر بطور یادگار کھینچ دینی مناسب ہے تاکہ آئندہ
زمانے کے شرفا معلوم کریں کہ سابق زمانے میں اس فن شریف کی ایسی قدر و
منزلت تھی۔ اور عذر تفاخر کا یہ جواب ہے کہ جس کو بفضلہ جلسہ موصوف کے گواہان
معتبر و معظم سلمہم اللہ تعالےٰ میسر ہوں تو وہ اپنے دعوے سے بالکل کیوں دست بردار
ہو۔ اور جس کو یہ کرم مولیٰ ایک ایسے فن شریف میں کمال حاصل ہو تو اس کو چھپا کر
کس لئے کفران نعمت کا الزام لے۔

پس بلحاظ اَلمامور معذور مولّف نے فرمائش بزرگان کو قبول کیا گر
جملہ معترضہ میں حد سے زیادہ طول نہ ہو اس لیے امتثال امر کو اختتام اصل واقعہ
کے بعد رکھا۔

الحاصل ایک ہندو کو جو کہ نایک علاقہ کوتوالی کا تھا بسبب بیہودہ کلامی
کے خان موصوف نے تنبیہ کی تھی۔ اس نے جا کر کوتوال صاحب سے کچھ ایسی
اشتعالک کے ساتھ استغاثہ کیا کہ کوتوال صاحب نے بے تحاشا خان موصوف کو
گرفتار کر لانے کا حکم دیا اور جمعیت کوتوالی کی آگئی۔ اس زمانے کے شرفا میں
یہ صفت تھی کہ اپنے دوست پر کوئی آفت آجاتی تو سب اس کے حامی و شریک حال

لفظ لذیذ نہ صرف تکلفانہ عرض کیا گیا ہے بلکہ واقعتاً کیونکہ مرزا غلام سجاد صاحب اشہر
اور نواب انوار جنگ بہادر داروغہ باورچیخانہ شاہی جو شاگردان قدیم والد استاد موصوف
کے تھے۔ ان ہر دو بزرگوں کے پاس جو جو اغذیہ نمکین و شیرین اطور خاص عمدہ تیار ہوتے
تھے وہ ان کے پاس سے تیار ہو کر آئے اور نواب صاحب ممدوح نمکین نے خاص
اپنے باورچیخانہ میں بھی تیار فرمائے تھے۔ الغرض بعد تناول طعام مسند بچھائی گئی
اور حسب الحکم استاد صاحب مولف مسند پر بیٹھا۔ استاد صاحب نے پھولوں کے
دو ہار پہلے اپنے گلے میں حمایل فرمائے بعد ازاں دو ہار مولف کے گلے میں ڈالے
اور ایک تمغہ نقرئی جو کہ **طوق مرتضیٰ علیؑ** کہلاتا ہے پہنایا۔ اس تمغہ کی وضع یہ ہے کہ
ایک ہلال نقرئی اس کے دونوں گوشوں میں کنڈے اور ان میں زنجیر تقدر دو دو بالشت
طول۔ اس ہلال پر مولف کا نام مع سنہ ۱۳۰۱ کندہ کیا ہوا۔ دوسرے سرے زنجیروں کے
ایک مختصر مدور تقطیع نقرئی کے کنڈوں میں لگے ہوئے اس تقطیع پر یا علیؑ مدد کندہ
کیا ہوا اور وہ تقطیع گردن پر رہتی ہے۔ الحاصل شئی موصوف پہنانے کے بعد استاد صاحب
نے باواز بلند فرمایا کہ میرا الرکہ صغیر السن ہونے کی وجہ سے میں نے انہیں اپنا جانشین کیا ہے
اور جو کچھ فن بنوٹ کا کمال ہے وہ سب انہیں بتا دیا ہے۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد میرے
فرزند کو یہ میری امانت سپرد کر دیں گے۔ آج سے جو صاحب فن کے طالب ہوں وہ ان سے
سیکھیں اور جو کچھ حاصل کرنا ہو ان سے حاصل کریں۔ بعد ازاں مسند سے اٹھ کر مولف نے
حضرت استاد کو اور نواب صاحب ممدوح کو نقد مولف میں نذر دی اور حسب حکم حضرت استاد

خان موصوف کے گھر آئے اور معذرت کی۔ چونکہ خلاف بیان سے بانی اس فساد کا
ہوا تھا اس کو خان موصوف کے روبرو حاضر کیا کہ آپ اس کو جو چاہیں سزا دیں۔
کیفیت جلسہ نشینی و خلافت واضح ہو کہ جب جناب استاد محمد وزارت علی صاحب
مرحوم کی علالت نے طول کھینچا اور صحت سے ناامیدی ہونے لگی تو نواب خانخانان بہادر
نے حسب رضائے استاد صاحب موصوف اپنے دولت سرا میں تقریب جانشینی
کا سامان مہیا فرمایا یعنی بتقرر تاریخ سترھویں ماہ رجب ۱۳۰۷ھ جو تاریخ میلاد شریف
صاحب ذوالفقار حیدر کرار علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے دعوت کے رقعے منجانب
استاد صاحب تقسیم ہوئے اور بتاریخ معینہ نواب صاحب ممدوح نے اپنی خاص
پنس روانہ فرمائی۔ استاد صاحب اس میں سوار ہو کر اپنے مکان سے جو قریب
ہی واقع تھا چلے ہیں تو چند شاگرد۔ ان خاص جن میں مولف بھی تھا پنس کو تھامے
ہوئے آہستہ آہستہ دولت سرائے نواب صاحب ممدوح میں پہنچے۔ اور جملہ
مہمانان معززین علاوہ نواب صاحب ممدوح اور ان کے نور چشم نواب شجاع الملک
بہادر کے کہ وہ خود مکین تھے نواب رکن الملک خان دوران بہادر مع برادرزادہ
نواب فطرت جنگ بہادر۔ اور نواب بہرام الدولہ بہادر۔ نواب انوار جنگ بہادر
وغیرہ امراد شرفا بہت سے شاگرد وغیر شاگرد رونق بخش جلسہ موصوف تھے۔ نواب
فخر الملک بہادر معین المہام عدالت و امور عامہ سرکار عالی بھی رونق افزائے
جلسہ مذکور ہونے والے تھے کسی سبب سے نہ ہو سکے۔ دستر خوان وسیع با اغذیہ لذیذ چنا گیا۔

بتائید شاہنشہ ذوالفقار	جو تھی دل کی بر آئی وہ آرزو
وزارت علی کا ہوا جانشیں	یہی آج یاروں میں ہے گفتگو
غلامی استاد ذی قدر کا	تا ایں ہے تمغہ بصد آبرو
کہا مصرع سال ناجی نے یہ	غلامی کا ہے طوق زیب گلو

اس کے بعد جملہ معززین جلسہ کی خدمت میں پھولوں کے ہار اور عطر مع پاندان پیش کش ہوئے اور عزا تہنیت سے مولف ناچیز کو معزز فرما کر رخصت ہوئے۔[۱۴]

سنا گیا ہے کہ مرزا عباس مرثیہ خوان کے غلام نے کسی سے مذہبی بحث میں سخت کلامی کی تھی بنابرآں ۱۲۶۴ھ میں بازاریاں اوباش و مفسدان بدمعاش نے جن کا مقصود اصل غارتگری تھا بظاہر مذہبی جوش و بباطن فکر نائے ونوش دین دین کہتے ہوئے امامیہ مذہب والوں پر حملہ کرنے کا سامان کیا اور مکہ مسجد میں جمع ہونے لگے۔ سامان کرنے سے مراد یہ کہ دشنام وغیرہ لکھ کر مشائخین و علمائے کاملین کے پاس منجانب فرقہ شیعہ روانہ کئے اور مسجدوں کے دروازوں پر لگائے پھر آپ ہی علما و مشائخین کی خدمت میں جاکر شکایت کی کہ اب یہ نوبت پہنچی ہے کہ رافضی لوگ ایسی تحریرات مسجدوں پر لگا رہے ہیں لہذا اب ہم سے صبر ہو نہیں سکتا آپ بھی چلیں اور فتویٰ جہاد کا دیں تا آنکہ مجبوراً علما و مشائخین کو مکہ مسجد میں جانا اور شریک عوام الناس ہونا پڑا۔ مگر علمائے اسلام خلاف ارشاد باری۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی۔ ہرگز فتویٰ نہ دیئے ہوں گے کہ ایک شخص مجرم ہو تو اس کے تمام فرقہ

پھر مسند پر بیٹھا۔ حضرت نے بآواز بلند ارشاد فرمایا کہ جو خاص میرے شاگرد ہیں اس وقت انھیں نذر دیں۔ اور بطور اتمام حجت یہ بھی فرمایا کہ اگر کسی کے پاس روپے موجود نہ ہوں تو مجھ سے مبادلہ لیں۔ بمجرد ارشاد حضرت جملہ شاگردوں نے مولف کو نذریں دیں مگر دو تین پیر بھائی صاحبوں کے نفس نے گوارہ نہ کیا اور اپنے مقام سے انہیں ہلنے نہ دیا عدول حکمی و ملال خاطر حضرت استاد کو قبول کر لیا۔

مقام غور ہے کہ اس خلافت میں کوئی حکومت و ثروت نہ تھی باوصف اس کے بعض نفوس سے ضبط نہ ہو سکا اور حسد باطنی کو ظاہر کر دیا۔ الحاصل نذریں ہونے کے بعد قطعہ بند تاریخ جو استادی جناب مولوی سید اصغر حسین صاحب قبلہ ناجیؔ مرحوم نے اسی وقت نظم فرمایا تھا اور شاگرد استادین موصوفین میر مومن علی صاحب نورؔ نے روبروے مسند استادہ ہو کر بآواز بلند پڑھا قطعہ بند مذکور یہ ہے۔

خوشا ماہ مولود شیر خدا		زہے روز میلاد شاہ نکو
جناب محمد وزارت علی		ہیں یاں زیب محفل بصد آبرو
چمن خان خاناں کا ہے آج قصر		خوشی سے ہے ہر غنچہ لب خندہ رو
غذائے لطیف اور وہ آب سرد		وہ حقے وہ پان اور پھولوں کی بو
جو دانش ہے شاگرد اُن کا رشید		وہ مشہور عالم میں ہے چار سو
بنوٹ اور دوانگ میں ہے کامل ہوا		بڑا ذی طبیعت ہے یہ نیک خو
جو ہے دوست اس کا رہے شاد ماں		ہمیشہ رہے خوار اس کا عدو

الغرض مدار المہامی سراج الملک بہادر کا زمانہ تھا۔ کوتوال طالب الدولہ بہادر نے ابتدائے مدار المہام بہادر سے عرض کی کہ اس وقت اجازت ہو تو ان مفسدوں کو جو مکہ مسجد میں جمع ہوئے ہیں باندھ لاتا ہوں مگر مدار المہام بہادر نے اجازت دینے میں دیر کی۔ کشش و پنچ میں رہے جب کہ عرصہ کے بعد اجازت دی تو کوتوال نے عرض کیا۔ اب ممکن نہیں کیونکہ وہاں مجمع کثیر ہو گیا ہے۔ فی الفور یہ کام کرنے کا تھا ؎

سر چشمہ شاید گرفتن بمیل ✽ چو پر شد نشاید گذشتن بہ پیل

اعلیحضرت نے بھی یقیناً حکم امتناعی جاری فرمایا ہوگا کیونکہ اپنے جان نثاروں کی باہم خونریزی و بربادی جس کا اثر سلطنت پر پڑتا ہو کس طرح گوارا فرماتے تھے۔ لیکن بلوائی عوام الناس کب مانتے تھے۔ الحاصل مکہ مسجد کے داروغہ کے فرزند معروف بہ بنی صاحب کو بجرم تشیع اسی مسجد میں پہلے ذبح کر ڈالا اور سر کو ان کے دروازہ مسجد میں آویزاں کیا۔ پھر دین دین کہتے ہوئے شاہ علی بنڈہ پر جا کر مرزا عباس مرثیہ خوان ملازم مہاراجہ چندو لعل بہادر کو مع چند اسموں کے جو ان کے گھر میں موجود تھے قتل کر ڈالا اور گھر کو لوٹ لیا۔ وہاں سے مغلپورہ اور سلطان شاہی کی جانب اس ہنگامے نے رخ کیا۔ وہاں جا کر چند شیعوں کے مکان لوٹے مکینوں کو قتل کیا۔ بعض شیعوں کو اہل ہمسایہ نے باوجود سنت وجماعت ہونے کے پناہ دی۔ جانوں سے بچ گئے مگر گھر لوٹے گئے۔ چنانچہ مولف کے خسر میر عباس علی

کلمہ گو کو قتل کرنا اور ان کے گھروں کو لوٹ لینا اور آگ لگا دینا کیونکر جائز ہو سکتا ہے
علمائے کاملین کا اگر بس چلتا تو فقط اسی کو سزا دیتے جس سے کہ جرم وقوع میں آنا
ثابت ہوتا مگر وہ بزرگوار لوگ کیا کر سکتے تھے۔ اس روز تو زور و شور عوام الناس
کا تھا جن میں روہیلے بھی شریک تھے یہ سب غازیگری کے شوق میں از خود رفتہ تھے
اور اس کی شہرت تمام بلدہ میں ہو گئی تھی۔

برادر فرخندہ یار جنگ مرحوم یعنی امام الدین خاں مرحوم جو مشاہیر و معززین
اہل سنت والجماعت سے تھے عالم حیات میں ایک روز ایک محفل میں کہ مولف بھی
حاضر تھا اس ذکر ہنگامہ مذکور کا حال بیان فرماتے تھے کہ جب میں جوان تھا۔
ہنگامہ مذکور کی خبر سن کر مع ایک دوست چونکہ پیادہ پائنجامہ و مال سے ڈھاٹا
باندھا ہوا بغرض تماشا مکہ مسجد میں گیا۔ دیکھا کہ عوام الناس مسلح جمع ہو رہے ہیں۔
نیز روہیلے ایک بڑا جھنڈا لیے ہوئے مستعد ہیں میں نے ایک روہیلے سے پوچھا
خاں صاحب رافضیوں کو مارنے جاتے ہو مگر رافضیوں کو پہچانو گے کس علامت سے
تو بیساختہ جواب دیا کہ جس کے منہ پر ڈاڑھی نہ ہو گی اس کو رافضی جانیں گے۔

امام الدین خاں موصوف کہتے تھے کہ یہ سنتے ہی میرے ہوش اڑے اور
میں نے اپنے دوست کی طرف دیکھا اور ہم دونوں وہاں سے ہوا ہو گئے کیونکہ
بسبب شباب کے ہماری بھی ڈاڑھیاں اس وقت صاف تھیں ایسا نہ ہو کہ پہلے
یہیں ہم پر ہاتھ صاف کریں۔

سید اصغر حسین صاحب مرحوم بیان فرماتے کہ میری عمر اس وقت دس برس کی تھی مجھ کو خوب یاد ہے کہ اس ہنگامہ و شورش کی خبر سن کر میرے والد مرحوم اور میرے برادر کلاں میر قربان علی صاحب مرحوم اور میر احمد حسین صاحب مرحوم پریشان ہوئے گو نظام رزیڈنسی تھا مگر اس زمانے میں رزیڈنسی کا ایسا بند و بست و تسلط نہ تھا اور بلدہ کی کوتوالی جیسی تھی معلوم۔ چونکہ وہ تاریخ مجلس فاتحہ سوم کی تھی یعنی ۱۲ محرم حسب معمول چند احباب ساکنان بلدہ مجلس میں شریک ہونے کی غرض سے آئے ہوئے تھے مگر وہ اس زمانے کے شرفا تھے ان کی شرافت نے اجازت نہ دی کہ ایسے عالم پریشانی اور آنے والی آفت میں دیدہ و دانستہ اپنے دوستوں کو چھوڑ دے کر چلے جائیں۔ بعد فراغ مجلس میرے والد مرحوم مع احباب جن میں نواب رضا علی خاں خاندانی رکن الدولہ مرحوم بھی جو کہ نہایت لائق اور فن شمشیر و تفنگ اندازی میں ہمعصروں پر فائق تھے جن کا ذکر قبل ازیں آچکا ہے موجود تھے۔ بیرون دروازہ مکان ایک چبوترہ تھا اس پر نکل کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دیکھیں آج تقدیر میں کیا ہے۔ اس اثنا میں بازار علی میاں کی طرف سے مفسدوں کا مجمع آیا۔ ان میں سے دو نفر آگے بڑھے اور نواب صاحب موصوف پر خطاب کیا کہ بول دم چار یار نواب نے کہا یہ کیا بدمعاشی و ہنگامہ آرائی ہے۔ یہ سنتے ہی ان دو میں سے ایک نے بندوق اٹھا کر نواب کو گولی مار ہی دی۔ نواب کے پاس بھی بندوق تیار رکھی ہوئی تھی فی الفور فیر کر دی جس کی گولی نے دونوں کو جو ایک کے عقب میں ایک تھا چھید ڈالا۔

منصبدار مرحوم مع متعلقین کو ہمسایہ کا ایک شخص لعل خاں نامی نے اپنے مکان میں
پناہ دی مگر اثاث البیت تمام لٹ گیا ۔ لٹیروں کی یہ حالت تھی کہ ایک مرغ خانگی
پر دو آدمیوں نے ہاتھ ڈالے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک پاؤں مرغ کا آیا
تاآنکہ زندہ مرغ کے دو ٹکڑے ہو گئے معاذ اللہ ۔ اسی محلہ میں دو بھائی معروف
بہ منجلے آغا اور بڑے آغا ایک ہی مکان میں تھے وہ دونوں شمشیر بکف باہر نکل آئے
اور داد مردانگی دے کر مقتول ہو گئے ۔ ہنوز زبان زد قدما ہے کہ وہ دونوں بھائی
جب حملہ کرتے تھے تو میدان ہو جاتا تھا ۔ فراریوں کے جوتے پاؤں سے چھوٹے ہوئے
نظر آتے تھے الغرض وہاں سے فارغ ہو کر سراج الملک بہادر کی ڈیوڑھی کی جانب
دین دین کہتا ہوا بلوائیوں کا مجمع گیا ۔ مگر وہاں غالب جنگ بہادر جمعدار کے عرب
بغرض حفاظت بالاخانوں پر موجود تھے ۔ جب وہ بلوائی زد میں گولی کی آئے تو
عربوں نے بندوقیں سیدھی کر کے آواز دی کہ دین دین شاہ علی بنڈہ یہاں نہیں یہ
سراج الملک بہادر کا مکان ہے ۔ یہ دیکھ کر وہ مجمع واپس ہو گیا ۔ اسی سال
طالب الدولہ بہادر خدمت کوتوالی سے علیحدہ ہو گئے ۔ اس کے دو برس بعد بتاریخ
۱۲ ماہ محرم ۱۲۶۶ھ میں باغوائے اشتعالک حکیم تاج الدین ساکن قطبی گوڑہ جو
سخت متعصب شخص تھا اطراف و جوانب رزیڈنسی کے اوباش نے مجتمع ہو کر
میر صلابت علی صاحب نیابت خانی مرحوم کے مکان واقع رزیڈنسی پر حملہ کیا ۔
وہاں سوائے میر موصوف کے اور کسی شیعہ کا مکان نہ تھا ۔ میر موصوف کے فرزند

الغرض ہمارے حق میں اس روز معرکہ کربلا کا نمونہ تھا۔ بعد ان تمام ظلموں کے کوتوال محمد وزیر نے یہ انتظام و انصاف کیا یعنی قرآن شریف بیچ میں لاکر اور قسم کھاکر کہا کہ اب کوئی تمھیں اذیت نہ دے گا تم لوگ ہتیار اپنے دے دو۔ مگر قسم کا مطلق لحاظ نہ رکھا۔ بمجرد ہتیار لے لینے کے تلواروں سے اور تمنچوں سے مارے جن کے سبب سے میرے برادر میر قربان علی صاحب زخمی ہوئے۔ والد کو گولی لگی۔ ارادت علی خاں فرزند عالم علی خاں کے مارے گئے۔ چند احباب بقیت السیف یعنے میر علی حسین طوبی اور نصر اللہ خاں وغیرہ کو اور میرے برادر صاحب مجروح شدہ کو کوتوال صاحب گرفتار کرکے لے گئے اور قید کیا۔ میر روشن علی خاں شاہ سوار جن کا ذکر قبل ازیں آچکا ہے ان کو اور میرے والد کو گولی لگی تھی اس غدر پران دونوں صاحبوں کو جنید خاں اور چھاپا میاں پٹھان ڈاکٹر خانہ رزیڈنسی میں لے گئے ایسی مصیبت کے وقت والد کے چند احباب سنت والجماعت اور مہدوی پٹھان نہایت کام آئے یعنی جنید خاں اور چھاپا میاں مذکورین۔ بعد ازاں محمد فخر الدین حیدر خزانچی رزیڈنٹ بہادر نے بھی ہم بال بچوں کو جو جسم کے لباس سے رہ گئے تھے ایک مکان میں لیجاکر رکھا اور خبر گیراں رہے۔ تمام ہوا بیان مولف کے استاد ناجی صاحب موصوف کا۔

المختصر جب زخمیوں نے صحت اور اسیروں نے رہائی بصد زحمت پائی تو میر صلابت علی صاحب مع فرزندان و عیال و اطفال بے خانماں و بے سروسامان کوہ شریف وغیرہ مقاموں پر دو ایک سال باہر رہے تاآنکہ سراج الملک بہادر نے

مولف کے استاد موصوف فرماتے تھے کہ جب یہ ہنگامہ محشر بنا شروع ہو گیا تو میرے والد و برادران و احباب نواب مجروح کو لے کر باہر سے اندر یعنی دیوانخانے میں آگئے اور دروازہ بند کر لیا گیا۔ پھر تو بلوائیوں نے مکان کو گھیر لیا۔ اس وقت کے کوتوال بلدہ محمد وزیر جو بغرض رفع فساد بلدے سے آئے تھے ان کے آنے سے اور ہنگامہ بڑھ گیا۔ یعنی کوتوال صاحب جو سوار فیل تھے بندوقوں کی آوازیں سن کر چادر گھاٹ کے پل پر ٹھہر گئے اور ان کی ہمراہی جمعیت بھی شریک بلوائیاں ہو گئی متصل مکان جو میرے والد کی بنوائی ہوئی مسجد ہے اس کی چھت پر مفسدین چڑھ کر بندوقوں سے مارنے لگے سنگساری ہونے لگی۔ مولف کے استاد موصوف حضرت باجی فرماتے تھے کہ اس وقت کی حالت بھولی نہیں جاتی۔ باہر وہ شور و غل دشمنوں کا۔ اندر بچے بالے حواس باختہ ہراساں و اشک ریزاں۔ بام مسجد پر سے گولیاں جو برس رہی ہیں تو زخمی گھوڑا ہمارا رسیاں تڑا کر صحن دیوان خانے میں دوڑ رہا تھا۔ نواب صاحب موصوف جو باہر سے گولی کھائے ہوئے آکر ایک نوجوان شاگرد کے کے سہارے سے بیٹھے ہوئے تھے ان کو دوبارہ مسجد پر سے گولی مارنا جس گولی سے نواب و شاگرد دونوں کا خاتمہ بالخیر ہو جانا۔ خاکروب آنے کا علحدہ دروازہ جو عقب مکان واقع تھا اس میں سے بلوائیوں کی یورش زنانی مکان میں دفعتاً زنانی مکان میں ہونے سے مستورات و اطفال کا مضطربانہ دیوان خانے میں چلے آنا۔ اثاث البیت تمام لوٹا جانا۔ شریروں کا مکان کو آگ لگانا۔

وغیرہ راتوں کو تماشا گاہوں کے مجمعوں میں ایک دوسرے کو پا کر لڑ لیتے تھے خونریزیاں ہوتی تھیں ۔ نیز ماہ شعبان کی پندرھویں شب کو چوک میں ۔ بعد از اں صبح کو ملک پیٹ کے میدان میں جو بیرون دروازہ چادر گھاٹ واقع ہے بمقابلہ و مجادلۂ آتشبازی اکثر زخمی ہوتے تھے اور جل جاتے تھے خصوصاً تماشا بین ۔ عرسیات اور میلوں میں زخمی ہونا مارا جانا لوازمات سے تھا ۔ سو روپے ماہوار دار منصبدار یا بارہ سو روپے محاصل کے جاگیردار تک بھی اس زمانے میں سائیس یا کہار یا خدمتگار وغیرہ کو چوری یا کسی بھی جرم پر باندھ کر حاکمانہ مارتے تھے اور قید رکھتے تھے ۔ گویا گھر گھر حکومت تھی ۔ جب چھوٹے معاش والوں کی یہ حالت تھی تو غور کر سکتے ہیں کہ بڑے بڑے اسٹیٹوں کی کیا کیفیت ہوگی یعنی پائیگاہ امیر کبیر بہادر ۔ نواب صمصام الملک بہادر ۔ وغیرہ مرشد زادے ۔ عبد اللہ بن علی ۔ عمر بن عوض وغیرہ جمعداران عرب کے علاقہ کا کوئی عرب یا غیر بھی کسی کو قتل کر کے علانیہ ان کے علاقہ میں چلا جاتا تھا تو اس کو کوئی گرفتار نہیں کر سکتا تھا حتیٰ کہ کوتوالی بھی مانگے تو آسامی کو نہیں دیتے تھے ۔

قدیم لوگ حالات سابق کو دیکھے ہوئے بعض ہنوز موجود ہیں کہ اکثر گلیوں میں اور کنارہ جات شہر میں اور بعض شاہراہوں پر بھی جہاں کہ ویرانہ پن ہوتا تھا اور لوگ کم چلتے تھے ویسے مقاموں پر شام کے وقت کوئی تنہا غیر مسلح آدمی مل گیا تو ہتیار سے ڈرا کر لباس وغیرہ لوٹ لیتے تھے ۔ بفضلہ آبادی و کثرت مخلوق جس قدر کہ فی الحال ہے اس زمانے میں کہاں تھی ۔ اس لئے بلدے میں اکثر مقامات دوپہر دن کو اور شام ہوتے ہی

میر صاحب موصوف کو پرینڈے پر روانہ فرمایا اور قلعہ داری دی۔ مگر میر صاحب اس سے ناراض تھے اس لئے جلد استعفا دے دیا۔ اور والد نواب خانخاناں بہادر حال کے فخر الملک بہادر مغفور نے جو کہ سخا و کرم میں حاتم زماں تھے طلب فرما کر اپنی جاگیرات کا انتظام میر صاحب موصوف کے سپرد فرمایا۔ بعد ازاں بوجہ خوبی انتظام و شہرۂ دیانت داری اور بھی کئی امرا کی جاگیریں ان کی نگرانی میں آئیں۔ میر صاحب موصوف کی مظلومی و بے قصوری پر یہ امر دال ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں خداوند عالم نے انہیں اور ان کی اولاد کو سابق سے کہیں زیادہ عزت و ثروت عطا فرمائی۔

اس ہنگامے کے بعد یعنی ۱۴ ماہ صفر ۱۲۶۶ھ کو بسبب ابتری و بدنظمی کے محمد وزیر کوتوال معزول ہوا اور طالب الدولہ بہادر پھر بحال ہوئے۔ الحاصل پولیس کا کافی انتظام نہ ہونے سے شہر پشت اور بدمعاشوں کا بازار گرم تھا۔ خصوصاً جو سپاہی منش ہتھیار باندھنے والے اعلیٰ و ادنیٰ تھے اکثر اپنا انتقام آپ لے لیتے تھے۔ سرکار میں مستغیث نہیں ہوتے تھے اور دادرسی کے لائق عدالت کا انتظام بھی کہاں تھا۔ قرض خواہ اپنے مدیون کو سر راہ پکڑ لے کر اس کا لباس یا ہتھیار وغیرہ جو چیز فی الجملہ قیمتی پاتا بکمال ذلت چھین لیتا تھا۔ یا کوئی معتبر ضمانت لے کر چھوڑ دیتا تھا۔ مگر یہ برتاؤ قرض خواہ اسی مدیون کے ساتھ کرتا تھا جس کو آپ سے کمزور پاتا تھا۔ ورنہ مار دھاڑ کی نوبت آ کر مجروح و مقتول بھی ہوتے تھے۔ خانہ جنگیاں بارہ مہینے سینڈخانوں میں۔ کسبیوں کے مکانوں پر اکثر کشت و خون ہوتا تھا۔ ماہ محرم میں اکھاڑے والے

اب ناٹ شاہ کی بارہ دری کہلاتا ہے وہاں اپنا ایک کلی بردار ہمیشہ کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ جب کبھی بہادر موصوف کی سواری وہاں پہنچتی تھی تو کلی بردار مذکور جو کہ سامان مہیا رکھتا تھا فی الفور حلیم بدل دیتا تھا۔ جب بہادر موصوف مقتول و مرحوم ہوئے تو وہ کلی بردار فقیر ہو کر وہیں بیٹھ گیا اور ٹاٹ کا کرتا پہننے لگا اس لئے وہ ٹاٹ شاہ مشہور ہوا۔

الحاصل بسبب بدامنی راہ غیر ایام عرس میں بغرض زیارت و نذر و نیاز وغیرہ بلدے سے متوسطین لوگ جاتے تھے تو چند جوان کہیں سے پروانگی لے کر مع سواری ہائے مردانہ و زنانہ ایک دم مل کر جاتے تھے۔ جیسا کہ اب ایک ضعیفہ بھی تنہا جاتی آتی ہے۔ اس وقت مجال نہ تھی۔ اسی طرح بیرون بلدہ کے دوسرے جوانب کا بھی حال تھا۔

دروازۂ باغ لنگم پلّی کی بائیں جانب پختہ سڑک عہد مغفور میں بنی ہے ورنہ اس مقام پر ایک نالا بہتا رہتا تھا۔ سوار و پیدل سب اسی پانی میں سے جاتے تھے۔ کبھی پانی زیادہ رہا تو رتھ کے اندر آجاتا تھا۔

کرور گری کا انتظام بھی عہد سابق میں اچھا نہ تھا۔ از روئے موازنہ ۱۲۸۰ف مذکور یہ معلوم ہوا کہ اجناس وغیرہ کا محصول راہ داری تعلقات میں بھی لیتے تھے اور بلدے پر بھی محصول لیا جاتا تھا۔ جو تجارت کہ اندرون ملک سرکار عالی ہوتی تھی اس کے لئے تو نہایت تکلیفیں تھیں۔ محصول سایر تعلقات کا ہر حد بند تعلقہ میں اور مستاجر کے علاقہ میں اور تعلقات دیوانی اور تعلقات جاگیرداران میں نیز کرور گری

سنسان معلوم ہوتے تھے اور وہ کمین گاہ بدمعاشوں کی تھی علیٰ ہذا القیاس بیرون بلدہ کی حالت بھی ویسی ہی تھی۔ چنانچہ بلدے سے کوہ شریف تک جو چار کوس یعنی آٹھ میل کی مسافت ہے تنہا آدمی بخوف رہزنی جا نہیں سکتا تھا۔ اگر گیا تو لوٹا جاتا تھا۔ یوں تو سراسر جنگل بغیر سڑک کے بنڈیوں کا راستہ تھا۔ اسی راہ سے رتھ۔ میانہ۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ بنڈی وغیرہ عرس شریف وغیرہ عرس میں آتے جاتے تھے۔ لیکن اس راہ میں خصوصاً دو مقام لوٹے جانے کے مشہور تھے۔ ایک باغ لنگم پلی اور مقطعۂ اختیار خاں کے درمیان۔ دوسرا مقام تاڑشاہ کی بارہ دری۔ یہ دو مقام کمین گاہ رہزنوں کی تھی۔

تاڑشاہ مذکور کی کیفیت مولف نے قدیم بزرگوں سے سنی ہے کہ مقام مذکور پر ایک فقیر رہتا تھا اس نے اپنے تمام جسم پر تاڑ کی رسّی لپٹی تھی اس سبب سے اس کا نام تاڑشاہ مشہور ہو گیا تھا۔ ایک روز قضاء حاجت کے لئے وہ فقیر جنگل میں گیا تھا اتفاقاً پانی شدت سے برسا اور کسی درخت وغیرہ کا سہارا چھپنے کے واسطے نہ ملا فقیر کے ٹخنوں سے لے کر گردن تک تاڑ کی رسّی جسم پر جو مدت سے لپٹی ہوئی تھی وہ تمام بھیگ کر دفعتاً اینٹھی۔ شاہ صاحب بیچارے کیا کر سکتے تھے اور جنگل میں کوئی مدد دینے والا بھی نہ تھا۔ خصوصاً سینہ و شکم کی رسّی نے ایسا دبایا کہ شاہ صاحب کا دم نکل گیا۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون۔

ایک روایت یہ ہے کہ رکن الدولہ بہادر اکثر کوہ شریف کی زیارت کو جایا کرتے تھے۔ حقہ کا از بسکہ شوق تھا سواری میں بھی حقہ پیتے رہتے تھے لہذا جو مقام کہ

جملہ دروازوں پر شہر پناہ کے یہ ناجائز تحصیل موقوف ہونے کے لئے حکم محکم جاری فرمادیا۔ جب سے وہ تحصیل بالکل موقوف ہوگئی۔

نیز جلانے کی لکڑیوں کی بنڈیاں جو باہر سے بلدے میں آتیں تو پہلے دربان شہر پناہ فی بنڈی ایک لکڑی بزور لیتا تھا۔ بعد ازاں کوتوالی کے جس ٹھانے پر گزر ہوتا یا کسی ایسے دروازے پر سے بنڈی گزرتی کہ جس پر پہرے کے جوان ہوتے تو ایک ایک لکڑی فی بنڈی لی جاتی تھی۔ موئلف نے بچشم خود دیکھا ہے کہ اگر بنڈی والا لکڑی دینے میں تامل کرتا تو ٹھانے کا جوان خود بڑھ کر بنڈی میں سے لکڑی کھینچ لیتا تھا۔ علی ہذا القیاس کوئلوں کی یا چونہ وغیرہ کی بنڈی کوئی آجاتی تو اس پر بھی وہی جبر ہوتا تھا۔ اور یہ جبر بلدے پر ہی منحصر نہ تھا بلکہ بیرون بلدہ بھی جاری تھا۔

زمانۂ سابق میں جو چلنی روپے کہلاتے اور رائج تھے وہ ایک قسم کے نہ تھے بلکہ اقسام کے اور مختلف مقامات کے بنے ہوئے تھے یعنے۔ گدوالی۔ سگور۔ گرمٹکالی۔ ارکاٹی۔ دولت آبادی۔ گوپال پیٹی۔ امراوتی۔ شہر چلنی زری ٹکہ۔ ذوالفقاری شمشیری۔ نارائن پیٹی۔ چاندوری۔ ناگپوری۔ اندوری بہادر شاہی۔ شاہجہانی۔ پٹن شاہی۔ عالمگیری۔ گوبند بخشی۔ حالی کہنہ وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایک سرکار عالی میں کئی سکے رائج تھے حالانکہ یہ طریقہ خلاف دستور سلطنت تھا۔

بلدے میں بھی محصول لیا جاتا تھا۔ ہرچند خفیف و قلیل محصولات ہوں مگر ناگوار تھے
اور سب کا حساب کریں تو محصول کی ایک بڑی مقدار ہو جاتی تھی چنانچہ اندازہ
کیا گیا تھا تو رقم جملہ محصولات کی مال تجارت پر فی صدی پندرہ روپے ہوتی تھی الخ
اس سے ظاہر ہے کہ محصولات اس قدر اور راستے بے امن ہوں تو تجارت
سوائے گھٹنے کے ترقی کیونکر کرتی۔ اور تجارت کے گھٹنے سے نقصان سرکار کیوں
متصور نہ ہوتا۔ مغفور اول کے اوائل عہد دیوانی تک بھی یہ کیفیت تھی کہ سوائے
امرائے ذی حشم کے دوسروں کی زنانی سواری میانہ ہو یا رتھ۔ شہر کے باہر جانا
چاہتے یا باہر سے اندر آتی تو شہر پناہ کے دربان فی سواری چار آنے لئے بغیر جانے
یا آنے نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ اسی زمانے میں کہ مولف خورد سال تھا مولف کے
والد مرحوم نے ارادہ کوہ شریف کا فرمایا تھا۔ زنانی سواریاں روانہ ہونے کے بعد
والد مرحوم سرکاری پروانگی کے ہاتھی پر مع اطفال سوار ہو کر چلے۔ جب چادر گھاٹ
کے دروازے پر پہنچے تو دیکھا زنانی سواریاں رکی گئیں ہیں۔ سبب پوچھا تو معلوم
ہوا کہ فی میانہ از رتھ چار آنے لئے بغیر دربان جانے نہیں دیتا۔ اس وقت
تو مجبوراً پیسے دلوا دئے مگر بعد واپسی مولف کے برادر کلاں میر اسد علی صاحب نے
جو کتاب خانہ علاقہ نواب صاحب مغفور کے مہتمم تھے جن کا حقیقی نبیرہ سید اعجاز حسین سلمہ
ہو فی الحال اول مددگار معتمد مالگزاری سرکار عالی ہے نواب صاحب مغفور کی
خدمت میں اس واقعہ کو مفصل عرض کر دیا۔ مجرد سماعت فرمانے کے مغفور نے

اہل خدمات کے لئے اطبائے یونانی حاذق تھے مگر عام رعایا و مساکین کو علاج باقاعدہ سے سخت محرومی تھی۔ اکثر بیمار غربا عطائی دوا کھا لیتے تھے یا کسی نیم حکیم کے مطب سے جو کچھ دوا میسر ہوتی استعمال کرتے۔ اگر سرطان وغیرہ کوئی پھوڑا کسی کو نکلتا یا ہاتھ پاؤں شکستہ ہوتے تو عطائی تیے پالے باندھتے تھے یا ممکن ہوا تو جراح سے ملتجی ہوتے تھے زخمی کو ٹانکے بھی جراح دیتے تھے مگر اسی کہنہ سوزن سے جو ان کے پاس قدیم سے رہتی آئی ہے۔ اور پھوڑے کو چیرتے بھی تھے لیکن اسی زنگ خوردہ نشتر سے جو پشتینی ان کے پاس چلا آرہا ہے۔ مگر یونانی اطباء کی نسبت تو زمانہ سابق پر اس زمانے کو ترجیح دے نہیں سکتے ہیں۔ اس امر خاص میں البتہ یہ زمانہ گھٹا ہوا ہے۔ زمانہ سابق میں حکیم رضا علی خاں مولف یادگار رضائی۔ مسیح الدولہ۔ حکیم شفا خاں۔ حکیم صفدر۔ حکیم میر جعفر علی۔ حکیم حر علی۔ وغیرہ اطبا نے حاذق و لائق تھے۔ اس زمانے میں ویسے طبیب کم یاب ہیں تحصیل علم طبابت کئے ہوئے باقاعدہ شاید کہ چند ہوں ورنہ اکثر بغیر قابلیت کے طبیب بن بیٹھے ہیں۔ اور مطب کی گرم بازاری و شہرت تو منحصر ہے عام مخلوق کو تیار دوا مفت دینے پر۔ سفوف، گولیاں، عرق رطب دیا بس بنا لے کر بیٹھ گئے بس مطب گرم ہو گیا اور اسی گرمی مطب نے طبیب صاحب کو مانند عرق کے پستی سے بلندی پر پہونچا دیا۔ چونکہ یہ زمانہ رواج ڈاکٹری و طبابت انگریزی کا ہے اس لئے سرکار عالی کو اس کی طرف چنداں اعتنا نہیں۔ برایں ہم کئی بار سرکاری حکم جاری ہونے کے چرچے ہوے کہ جو بے سبب طبیب بن کر بیٹھے ہیں ان سے

گوبند بخشی کی نسبت بستان آصفیہ صفحہ (۶۲۵) میں مرقوم ہے کہ کسی زمانے میں برادر راجہ چندو لعل گوبند بخش کا ایسا زور تھا کہ حیدرآباد میں ان کے نام کا سکہ جاری ہوا اور ۱۲۲۷ھ سے ۱۲۳۵ھ تک دیکھا گیا ہے جس کو سکہ گوبند بخشی کہتے تھے۔

الغرض سکورا اور گدوالی و حالی کہنہ وغیرہ عام طور پر بلدہ و تعلقات میں جو رائج تھے وہ کم عیار و کم وزن ہونے کی وجہ سے ان کا خوردہ کم آتا تھا۔ جس کے باعث بے برکتی ہوتی تھی۔ پہلے اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ چلنی روپیہ مشین سے بنتا نہ تھا بلکہ گھڑا جاتا تھا اور ٹھپا ہوتا تھا۔ اور صرافان بازار کا یہ چلن کہ اس روپے میں اقسام کے بٹے یعنی عیب لگاتے تھے۔ روپے کے کنارے میں ذری بھی تڑک ہوتی تھی تو پھوٹا ہے کہہ کر مقررہ خوردہ میں دو تین پیسے کم دیتے تھے یا ذری لکیر اس کے سطح پر نظر آتی یا ذرا گڑھا ہوتا تو چکلہ ہے کہہ کر پانچ چھ پیسے بٹا لگاتے یا گونہ میلا پن ہوتا تو کڑا ہے کہہ کر چار یا پانچ پیسے بٹا لیتے یا چمکدار ہوتا تو بھی کئی پیسے بٹے کے لیتے بلکہ خوردہ دینے کو بھی انکار کرتے تھے کہ یہ روپیہ چکنا ہے۔ جس پر تلوار کا نشان ہوتا تو اس کو شمشیری ہے کہہ کر خوردہ کم دیتے۔ جس کے حروف بسبب استعمال مٹے ہوئے ہوتے تو سلپٹ ہے کہہ کر واپس دیتے۔ الحاصل سکہ کی ایسی بد انتظامی کے سبب سے بھی رعایا کو نہایت پریشانی اور نقصان ہوتا تھا۔

زمانۂ سابق میں یہاں **طبابت** انگریزی کی تعلیم تھی نہ کوئی ڈاکٹر تھا۔ عہد دیوانی سراج الملک مرحوم میں مدرسہ طبی انگریزی رزیڈنسی میں ابتدائً قائم ہوا۔

نقص و عیب کو زمین ڈھانک لیتی ہے کسی پر کھلتا نہیں۔

تعلیم اطفال شرفائے کم استطاعت کے واسطے زمانۂ سلف میں نہ سرکاری مدرسے تھے نہ تعلیم کا سامان کافی میسر ہوتا تھا اس لئے اکثر شرفا کم سواد تھے۔ محلّے بھر میں کوئی صاحب سواد ہوتا تھا تو سب اس کے محتاج رہتے تھے یعنی کوئی خط وغیرہ کی تحریر کی ضرورت ہوتی تو اس سے پڑھواتے تھے اور منّت لکھواتے تھے۔ اطفال کو پڑھانے کے لئے استاد ذی علم و لائق میسّر نہیں ہوتا تھا۔ اگر کوئی ذی علم نامور ہوتا تو وہ پڑھانے کی نوکری کو گوارا کرتا تھا نہ ہر ایک شریف کو مقدرت اس کے لائق ماہوار دینے کی تھی۔ بعض شوقین طالب علم اس کے مکان پر جا کر درس لیتے تھے۔ اس زمانے میں کوئی کتاب قلمی گلستان وغیرہ کسی کے پاس ہوتی تھی تو طالب علم اس کے بہزار منّت و زحمت مالک کتاب کے مکان ہی پر بیٹھ کر اس کی نقل کر لیتے تھے۔ ازبسکہ کتابیں کم یاب تھیں مالک کتاب کا دل بطور مستعار بھی دینے کو نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں مکتوب پڑھائے جاتے تھے یعنی لائق لوگوں کے فارسی خطوط و عرائض وغیرہ مختلف تحریرات قلمی جمع کر کے یکے بعد دیگرے ان سب کو جوڑ کر ایک طولانی طومار بنا تے تھے اور اس کو لپیٹ کر تولہ نبار کہتے تھے۔ بعد ختم قرآن شریف ابتدائی کتابیں فارسی کی پڑھ کر وہ مکتوب پڑھاتے۔ اس کے پڑھانے سے یہ نفع بھی تھا کہ اقسام کے خطوط یعنی نستعلیق شکستہ۔ شکستہ آمیز۔ شفیعہ۔ منقدیانہ میرزائی نسخ۔ نستعلیق طبعی وغیرہ خطوط پڑھنے کی مہارت حاصل ہوتی تھی لیکن سوائے

امتحان لیا جائے گا کیوں کہ ناقص طبیبوں سے بندگان خدا کے لئے خطرۂ جان ہے۔
حکم موصوف کی تعمیل تو نہ ہوئی مگر جو ایسے بے سند و ناکام اطبّا تھے وہ ہوشیار ہو کر
کسی بھی تدبیر و توسّل سے صاحب سند لامحالہ ہو گئے ہوں گے۔ اہل دنیا کو حصول
زر کے لئے صدہا ذرایع ہیں مگر یہ طریقہ طبیب بن جانے کا تو نہ اختیار کریں کہ یہ
بڑا نازک فن ہے۔ اس میں جانوں کی ذمہ داری ہے۔ خصوصاً طبیب غیر حاذق
و ناقابل ایسے قاتل ہیں کہ ان کی قتّالی ظاہر نہیں ہوتی ہے مگر عالم ستّر والخفیات سے
کیونکر چھپا سکتے ہیں۔ اس مقام پر ایک **حکایت** مناسب و دلچسپ یاد آگئی ہے
ناظرین سے توقع ہے کہ نامناسب تصور نہ فرمائیں گے۔ وہ یہ کہ دو شخص باہم دوست
تھے ایک ان میں کا جو مصوّر تھا اس نے ہجرت اختیار کی۔ بعد ایک عرصے کے مصوّر
کا دوست بھی کسی ضرورت سے سفر کو نکلا۔ جب ایک ملک میں پہنچا تو وہاں ایک مقام
پر مجمع لوگوں کا پایا۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ کسی طبیب کا مطب ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر
حکیم صاحب پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ وہی دوست ہے جو اپنے شہر میں مصوّری کرتا تھا۔
اس کو تعجب ہوا کہ یہ طبیب کیونکر بن گیا ہے۔ تا آنکہ بیماروں کا مجمع چلا گیا حکیم صاحب
تنہا رہ گئے اس وقت یہ دوست حکیم صاحب کے پاس گیا۔ صاحب سلامت و خیر و عافیت
کے بعد پوچھا کہ آپ تو وطن میں مصوّر تھے یہاں حکیم و طبیب کیسے بن گئے تو کہا اے یار
کیا کروں کیسی ہی محنت اٹھا کر میں کھینچتا تھا تو ناظرین ایک نہ ایک عیب اس میں
نکالتے تھے اس لئے تنگ آ کر مصوّری چھوڑ دی اور یہاں طبیب بن گیا ہوں کہ اس فن کے

سادہ و باافشاں نقرئی۔ اس کاغذ سرخ کا استعمال خوشی کی تقریبات میں ہوتا تھا۔
جلوس وسامان شادی کے مطلوبے اور استمداد مصارف شادی کی عرضیاں اسی سرخ
کاغذ پر لکھ کر سرکاروں میں گزرانے جاتے تھے۔ اسم نویسی (تحریر خواستگاری) منجانب
پسر اسی سرخ سادہ یا افشانی پر لکھ کر دختر والوں کے پاس بامید منظوری بھیجتے تھے۔
زیور وغیرہ اشیائے جہیز کی فہرست بھی اسی سرخ کاغذ پر لکھی جاتی تھی۔ دعوت شادی
وبسم اللہ خوانی وغیرہ تقریبات کے رقعے اسی سرخ کاغذ پر لکھتے تھے۔ قدیم رقعوں کی
وضع یہ تھی کہ سرخ کاغذ جس پر تحریر دعوت ہوتی تھی اس کو تہ کر کے اس پر شربتی کاغذ
قدرے طویل بطور لفافہ لپیٹ کر دونوں طرف کے گوشوں میں شکن ڈال لیتے تھے تاکہ
اندر کا رقعہ نکل نہ سکے اور بیچ میں سرخ کاغذ کی پٹی تخمینا ایک انچ عرض کی جس کو
کمربند کہتے ہیں لپیٹ کر چسپاں کرتے تھے۔ سرخ کمربند سے معلوم ہو جاتا تھا کہ تقریب
خوشی کا رقعہ ہے۔ اور سبز کمربند سے مجلس عزا کا یا دعوت نیازات وغیرہ کا۔ بعض اندر
اور باہر کا مع کمربند جملہ کاغذ سرخ کے رقعے صاحب مقدرت کاغذ سرخ باافشاں
کے رقعے تقریبات خوشی میں تقسیم کرتے تھے۔ ان قدیم رقعوں کی شکل یہ تھی۔
مگر حسب وسعت صفحہ بطور نمونہ یہ تصویریں چھوٹی چھوٹی بنائی گئی ہیں۔
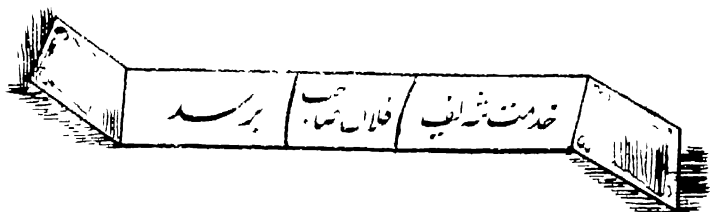
اس نفع کے اس کے رواج کا یہ بھی سبب تھا کہ کتابیں نایاب تھیں اور کاتب کم یاب لہٰذا کسی کتاب کا نقل کرنی بھی خالی از دقت نہ تھی۔ **کاغذ** اس وقت وہی دیسی تھے۔ قاسم بیگی۔ شربتی ادنیٰ و اعلیٰ۔ دولت آبادی ادنیٰ و اعلیٰ۔ شربتی ادنیٰ کے لئے روشنائی گاڑھی لازم ہے ورنہ پھیکی یعنی رقیق ہو تو حروف پھیل کر دوسری جانب بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ شربتی کاغذ باریک و مُہرہ دار ہوتا ہے۔ اس کا شربتی نام اس لئے ہے کہ دیسی سفید شکر کے شربت کا سا رنگ اس میں ہوتا ہے۔ قاسم بیگی نہایت سفید قدرے مُہرہ دار ہوتا ہے۔ دولت آبادی گو نہ شربتی رنگ ادنیٰ و اعلیٰ ہوتا ہے دبیز و مُہرہ دار۔ یہ دیسی کاغذ پائدار ہوتے ہیں۔ پانی وغیرہ کا صدمہ نہ ہو تو صدہا سال رہتے ہیں بوسیدہ نہیں ہوتے۔ مگر شربتی ادنیٰ اور قاسم بیگی کاغذ برس چھ مہینے ایک حال پر سرد مقام میں رکھا رہے اور ورق گردانی نہ ہو تو اس میں کیڑا پیدا ہو کر سوراخ ڈال دیتا ہے۔ یہ کاغذ ٹاٹ کے پارینہ ٹکڑوں سے اکثر بناتے ہیں اور ٹاٹ سن سے یعنی امباڑے کی چھال سے بنایا جاتا ہے۔ زمانۂ سابق میں جملہ دفاتر سرکاری وغیرہ تمام ملک میں یہی دیسی کاغذ مستعمل تھا۔ اسناد و احکام اسی کاغذ دولت آبادی وغیرہ پر لکھے جاتے تھے۔ ساہوکاروں کی بہیاں انہیں دیسی کاغذوں کی ہوتی تھیں اور ہنوز ہوتی ہیں۔ علاوہ پائیداری کے اس کاغذ میں یہ صفت بھی ہے کہ اس پر جو لکھا گیا پھر وہ مٹتا نہیں اگر کسی حرف کو چھیل کر بنائیں تو وہ صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ کاغذ با افشاں طلائی و نقرئی بھی ہوتا ہے اور سرخ بھی ہوتا ہے

قدیم زمانے میں خاص طور پر کشمیری کاغذ بھی مستعمل تھا مگر بسبب کم یاب و گراں قیمت ہونے کے استعمال اس کا عموماً نہ تھا۔ بعض شوقین بخبوره وادعیہ وغیرہ کشمیری کاغذ پر خوشخط لکھواتے تھے۔ نگہداشت نہ ہو تو کشمیری کاغذ میں بھی بہت جلد کرم پیدا ہوتا ہے۔ مشق خط کے لئے کسی قسم کے کاغذ کو باہم وصل کرتے ہیں جس کا نام وصلی ہے۔ اس پر آہار ہوتا ہے اس لئے مہرہ کر کے لکھتے ہیں۔ چنانچہ خوشنویسوں میں اب بھی اس کا استعمال ہے۔

قدیم کاغذ کے ساتھ **روشنائی** کا بھی حال بیان کرنا چاہیے واضح ہو کہ سابق زمانے میں ابتداءً مشق خط کے لئے خطاطی کے شوقین چاول یا کتھے کی روشنائی بناتے تھے جس میں گونہ سرخی ہوتی تھی۔ ورنہ کتابت خانگی دفاتر سرکاری وغیرہ جملہ ملک میں یہی روشنائی مستعمل تھی اس کے سوائے کوئی روشنائی کسی رنگ کی نہ تھی۔ اس سیاہی کا جزو اعظم کاجل ہے۔ باقی بہیکڑی۔ ماجو۔ صمغ عربی وغیرہ۔ تحریر کتابت میں ابواب و فصول وغیرہ مخصوص کلمات شنجرف کی روشنائی سے لکھتے تھے چنانچہ اس زمانہ میں ویسے کلمات کو جلی قلم سے لکھتے ہیں اور اس کو سرخی کہتے ہیں۔ شنجرف کو لیمو وغیرہ سے صاف کرنے میں تو اس کی تیرگی دور ہو کر نہایت سرخ خوش رنگ ہوتا ہے۔ اس سے جدول بھی کھینچتے تھے۔ بعض خوشنویس و خطاط شوقین جدول کشی و نقاشی کے لئے سفیدہ و لاجوردی و نیلگوں وغیرہ رنگ تیار کرتے تھے۔ سفیدہ سے سیاہ یا نیلگوں وغیرہ رنگین کاغذ پر لکھتے بھی تھے۔ سبز رنگ زنگار سے بناتے تھے جس کی
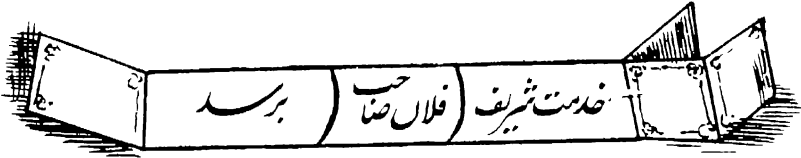
تقریب خوشی کے سوائے دیگر امور کے رقعے بھی ایسے ہی بغیر سرخ کاغذ کے ہوتے تھے۔ قدیم رقعہ کی جب شکل بتلائی گئی ہے تو لازم ہوا کہ اس کی طرز تحریر بھی ملاحظہ ناظرین میں آئے۔ یہ تو معلوم ہے کہ سابق میں تا عہد وزارت لائق علی خاں بہادر عماد السلطنت مرحوم یہاں جملہ تحریرات فارسی ہوتے تھے اور منجملہ تکلفات شادی یہ بھی تھا کہ رقعہ دعوت شادی با عبارات رنگین طولانی ہوتا تھا۔ یعنی حمد و نعت مقفّا و مسجع و استعارات رنگین اور گل و بلبل و نشاط و انبساط و تہنیت بہاریہ فارسی سے تمام صفحہ جب بھرا تو۔ اما بعد بتاریخ ماہ روز تقریب نور چشم طول عمرہ مقرر۔ ترصد کہ بوقت رونق افزائے محفل نشاط شدہ داعی را ممنون و مبتہج خواہند فرمود زیادہ ایام شادمانی مدام بکام باد فقط المکلف

ایسے رقعہ کو ہر ایک تو پڑھ نہیں سکتا تھا لہذا عموماً صرف آخر کی ایک دو سطریں دیکھ لیتے تھے جن میں تاریخ و وقت وغیرہ دعوت مندرج رہتا تھا۔

اگر رقعہ مختصر بھی ہوتا تھا تو حمد و نعت مختصر کے بعد ذکر تقریب مع تاریخ و یوم و وقت و نام صاحب تقریب لکھ کر استدعائے شرکت بزم نشاط اور آخر میں ایام شادمانی بکام باد لکھنا لازمی تھا۔

نواب صاحب مغفور نے اپنے خواہر زادہ مکرم الدولہ بہادر کو اس مدرسہ میں داخل فرمایا۔ یہ دیکھ کر امرا و معززین اوّل تو متعجب ہوئے بعد ازاں رفتہ رفتہ منصبدار زادے وغیرہ داخل مدرسہ ہونے لگے۔ مولوی شیخ احمد صاحب و مولوی محمد صدیق صاحب ہر دو برادر جو بعد ازاں ترقی کر کے مخاطب بہ رفعت یار جنگ بہادر و عماد جنگ بہادر ہوئے اسی مدرسے کے طالب علم تھے۔

جب مکرم الدولہ بہادر شریک مدرسہ ہوئے تو مولوی شیخ احمد صاحب بہادر کو سبق یاد دلانے لگے اور رابطہ باہم پہنچا یا اور وہ باعث ملازمت و ترقی صاحب موصوف کا ہوا۔ پھر بتدریج خطاب و عہدۂ جلیلہ صوبہ داری سے سرفراز ہوئے۔

جدول سبز سرخ جدول کے ساتھ نہایت خوش نما ہوتی تھی۔ مگر زنگار کی جدول کاغذ کو کھا جاتی ہے۔ چنانچہ اکثر قدیم کتابیں زنگاری جدول کی دیکھی گئیں ہیں کہ متن سے حاشیہ جدا ہو گیا ہے گویا کسی نے کاٹ دیا ہے۔

زمانۂ قدیم سے قلم بھی واسطی تھا جو فی الحال بھی بعض قدیم لوگوں کے پاس مستعمل ہے۔ ان قلموں میں بھی ادنیٰ و اعلیٰ ہوتے ہیں۔ عمدہ وہ جس میں سنگینی درشتی اور سیدھی ہو بلدار نہ ہو۔ رنگ اس کا سرخ مائل بہ سفیدی ہو۔ انہیں قلموں سے جلی بھی لکھتے تھے اور خفی بھی سوائے اس کے کوئی قلم نہ تھا۔

ہاں ایک قلم مانند جوار کے ڈنٹھلے کے موٹا اور سفید ہوتا ہے اس سے بعض اطفال ہندی تختی پر لکھتے تھے تختی ساگوانی صاف ہوتی ہے اس پر کھڑی لگا کر سکھانے کے بعد استاد اس قلم مذکور سے جس کو برُو کا قلم کہتے ہیں بغیر سیاہی کے خالی مفردات وغیرہ جلی لکھ دیتے تھے۔ اطفال ہندی اسی قلم سے اُن حروف قلمی استاد پر سیاہی سے لکھتے تھے۔

ابتداءً نواب صاحب مغفور نے ایک مدرسہ موسوم بہ دار العلوم اپنے مکان سرِراہ واقع بھٹ گٹی میں قایم فرمایا تھا کہ اطفال معززین و شرفا بلا فیس تعلیم عربی و فارسی و انگریزی پائیں اور جو لڑکا ایک حد معین تک پہنچتا تھا اُس کو پانچ سات روپے ماہوار ترغیبی سرکار سے ملتی تھی۔ مگر چند غریب لوگوں کے کسی معزز نے اپنے فرزند کو نہ بھیجا۔ یعنی مدرسہ میں پڑھانا معیوب و کسر شان سمجھتے تھے۔ تا آں کہ

چنانچہ تصاویر شیر جنگ بہادر وغیرہ جنگ بہادر سے ظاہر ہے۔ ان پیچوں کو گوشن پیچ کہتے تھے۔ بعض کی دستار و گوشن پیچ سفید وغیرہ ہم رنگ بھی ہوتے تھے۔ بعض کی دستار و گوشن پیچ ہر دو زرین ہوتے تھے۔ بہرحال اس زمانے میں گوشش پیچ کا عموماً رواج تھا اور بعض صاحبوں کا قول ہے کہ یہ گوشن پیچ بھی منجملہ عطایائے شاہی تھا لیکن مولف نے اس عہد کے عام و خاص جملہ تصاویر کی دستاروں پر گوشن پیچ دیکھے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اس کا رواج ہی تھا۔ بہرحال اس گوشش پیچ سے مقصود حفاظت دستار تھا کہ گھوڑے کی سواری وغیرہ کی تکان سے وستار گر نہ جائے کیونکہ وہ زمانہ اکثر جنگ وجدل کا تھا۔ نیز تصویر مذکور سے ہویدا ہے کہ اس زمانے کا لباس معزز زرین قلم کاری یا شالی یا ہمرو وغیرہ کا مانند قبائے عربی جس کو قبائے حسنی کہتے ہیں تھا مگر گھیر دار۔ اس کا بر مانند جامے کے داہنا بائیں طرف اور بایاں داہنے جانب آتا تھا۔ آستینیں ایک دوخت کی جسم کے برابر۔ اس کے بند رنگین وغیرہ درازگاؤدم آویزاں مانند بند جامہ کے ہوتے تھے۔ غالباً یہ قبا وہی ہے جو یہاں کے روسا بھی سابق میں پہنتے تھے اور اس کو دہتو کہتے تھے۔ کمر بنارسی وغیرہ زرین پٹکہ سے باندھی جاتی تھی جس کے دونوں سرے گرہ دینے کے بعد آویزاں رہتے تھے جیسا کہ نواب صاحب مغفور کے خاندان میں لباس درباری پر اب تک بھی اس کا رواج ہے۔ نیز اس زمانے کے تصاویر سے پیدا ہے کہ کمر میں کٹار یا قرول وغیرہ ضرور لگی رہتی تھی اور اس پر تلوار بھی ضرور رکھتے تھے۔ پاجامہ عموماً متروع

بیان لباس وغیرہ قدما و نواب صاحب مغفور

اس کو ناظرین غالباً بے ضرورت جانیں گے کیونکہ ہنوز وہ اوضاع قدما
بالکل مفقود نہیں ہوئے ہیں مگر جب بالکل نہ رہیں گے اور ڈھونڈے سے نہ ملیں گے
تو طبقۂ آیندہ کے لوگ ان اوضاع قدما کو جو مولف بیان کرنا چاہتا ہے غنیمت
جان کر بکمال اشتیاق دیکھیں گے۔ بیان مذکور اگرچہ انتظام سے تعلق نہیں رکھتا ہے
مگر زمانہ سابق کے حالات سے اور نواب صاحب مغفور سے تعلق رکھتا ہے اس لئے
ضمناً بیان کیا جاتا ہے۔

واضح ہو کہ زمانہ عالمگیر بادشاہ کے رؤسا و امراے ہند کی تصاویر سے
جن میں شیر جنگ بہادر وغیور جنگ بہادر اجداد نواب صاحب مغفور بھی تھے
ظاہر ہے کہ بینی دستار کی اونچی یعنی ابھری ہوئی ہوتی تھی اور دیوار بڑی۔ بوٹبدار پارچہ
کی دستار اکثر ہوتی تھی۔ بعض سفید بھی۔ وہ دستار سر پر رکھنے کے بعد چند پیچ علیحدہ پارچۂ
زریں تور وغیرہ اس دستار پر باندھتے تھے اور وہ پیچ بینی دستار کے اوپر سے یعنی بینی کو
نمایاں رکھ کر عقب گوش پر سے بعض نصف گوش وگردن پر سے کسے جاتے تھے اور
اس کا سرا بعض دستاروں کی بینی پر قایم ہو کر مانند گردن کے نمایاں رہتا تھا۔

کھڑکی دار ۔ پیٹھا ۔ شاہ نواز خانی ۔ سبحان خانی منصبداری جوڑی دار وغیرہ ہر ایک امیر و شریف اپنے خاندان کی دستار سر پر رکھتا تھا اور اس دستار سے پہچانا جاتا تھا کہ فلاں خاندان کا ہے ۔ دوسرے خاندان کی دستار سر پر رکھنا معیوب تھا ۔

دستار بند کے ہاتھ سے دستار بہت کم بندھوائے تھے اکثر اپنے ہی ہاتھ سے باندھ لیتے تھے حتّی امرا بھی ۔ اور یہ قول تھا کہ دستار بند کی محتاجی اچھی نہیں ۔ اگر بروقت ضرورت دستار بند نہ ملے تو کیا ہو ۔ چنانچہ اسی بنا پر اب تک بھی دستور ہے کہ شادی میں عروس کے گھر سے نوشاہ کے واسطے دستار جو آتی تو اسکے ساتھ دستار باندھنے کا سامان بھی رہتا ہے یعنی نقرئی آئینہ ۔ سلائی کٹوری کشتی تہ پانی کے لئے ضرور ہوتی ہے ۔ سلائی مانند چھری کے چپٹی ہوتی ہے اس سے دستار کے پیچ صاف کرتے ہیں ۔

مولّف کو خوب یاد ہے کہ تقریباً ۱۲۹۵ھ کے قبل بعض اہل ہند نے جو ہم محلہ مولّف تھے دستار بند سے لکھنوی چوگوشیہ ٹوپی کے مانند اونچی دستار بندھوائی اس کو دیکھ کر دوسرے بھی ویسی ہی بندھوانے لگے تا آنکہ نیر الملک بہادر ثالث معین المہام مرحوم فرزند خورد نواب صاحب مغفور نے ایک طرز نکالی یعنی سطح دستار کو قدرے پست کر کے پیچی کو مانند محراب کے بلند قرار دیا اور دیوار پس گردن اس قدر بڑھائی کہ نصف گردن اس میں پوشیدہ ہوتی ۔ اس طرز کا بھی رواج ہوا اور نام اس کا معین المہامی دستار قرار پایا ورنہ معین المہام موصوف کی دستار بھی ابتداءً مانند دستار عماد السلطنۃ تھی ۔

وغیرہ کے رنگین ہوتے تھے ۔ مولف نے صغیر سنی میں ایک بزرگ میر اصغر علی نامی کو جو سید تھے سپاہی ملازمت بارہ میں کے تھے دیکھا ہے اور خوب یاد ہے کہ وہ سبز مشروع کا پاجامہ پہنتے تھے ۔ زمرۂ انبیاز بان نظم جمعیت میں ملازم اور اسی محلہ دار الشفاء میں مقیم تھے ان کے فرزند معروف بہ مہدی صاحب گریباں چاک دس بارہ سال کے قبل تک زندہ تھے ۔

الحاصل زمانہ مذکور بالا میں یعنی عہد عالمگیر بادشاہ میں ادنیٰ لوگ بھی سلائیدار چھینٹ وغیرہ کے رنگین پاجامے پہنتے تھے جوتی عموماً بغیر ایڑی کے بوضع سلیپر زمانۂ حال مستعمل تھے۔

فی الحال نواب صاحب مغفور کی خاندانی دستار جو کھڑکی دار کہلاتی ہے ہمیشہ سفید ہوتی تھی مگر اتفاقاً کبھی اپنے ولی نعمت کی تقاریب خوشی میں گلابی وغیرہ دستار سر پر رکھتے تھے ۔ مانند اپنے چچا سراج الملک مرحوم کے نواب صاحب مغفور بھی اپنی دستار آپ باندھ لیتے تھے بغیر کلف کے خشک دستار ہوتی تھی ۔ پانی سے بھگوتے نہ تھے جیسا کہ دستار باندھنے والوں کا عموماً دستور ہے ۔ اسی وجہ سے مغفور کی دستار سر سے اتارتے ہی ٹوٹ جاتی تھی ۔ اور ہر وقت ضرورت مجدداً دستار باندھنا پڑتا تھا۔

بنی اس کی حسب دستور قدیم ہوتی تھی مگر دیوار زیادہ بلند نہیں چنانچہ مغفور کی تصویروں سے ظاہر ہے ۔ نیز عماد السلطنۃ مرحوم کی تصویر سے پیدا ہے کہ ان کی دستار بھی ویسی ہی تھی جیسی کہ اونچی بنی کی عموماً مروجہ فی الحال ہوئی ہے ایسی نہ تھی ۔

زمانۂ سابق میں اہل حیدرآباد دکن کی دستاریں انواع و اقسام کی تھیں

کی خاندانی دستار پر بھی کلا بتونی توڑا لپٹا جاتا ہے بطور چوغانہ۔ چونکہ بہادر موصوف نواب صاحب مغفور سے پشتینی توسل خاص رکھتے ہیں لہذا لازم ہے کہ تھوڑا سا حال بہادر موصوف کا بھی بقدر علم بیان کیا جائے۔ واضح ہو کہ نواب سرنایج جنگ بہادر کے پرداد یعنی میر چراغ علی خاں مرحوم منصب دار و معززین ریاست سے اور وابستۂ خاندان نواب صاحب مغفور تھے۔ دستور خاندان مغفور یہ رہا ہے کہ جب کوئی فرزند متولد ہو تو اس کو پہلے پہل کسی عابد و زاہدہ بیدانی کا دودھ تبرکاً تیمناً پلایا جاتا ہے جس وقت نواب صاحب مغفور متولد ہوئے تو بناءً علیہ میر چراغ علی خاں موصوف کی بیوی کا دودھ جو انہیں صفات سے متصفہ تھیں پہلے پہل پلایا گیا فلہذا توسل خان موصوف کا اس خاندان عالی سے بڑھ گیا اور مستوجب مزید عنایات ہو گئے چنانچہ فرزند میر چراغ علی خاں کے میر تہور علی خاں مختار جنگ جلال الدولہ مرحوم جو ہمشیر برادر رضائی نواب صاحب مغفور کے تھے جن کا سنہ ولادت پنجم صفر ۱۲۸۴ھ تھا باہم پرورش ہوئے اور نواب صاحب مغفور کے کوکا کہلانے لگے اور ان کے امور پرورش و عیدین منت مرادیں شادی بھائی وغیرہ جملہ ابواب کی کفیل بھی سرکار فیض آثار رہی۔ جب سن شعور کو پہنچے نواب صاحب مغفور نے معاش منصب سے سرفراز اور شاہی فیل خانے کی داروغگی سے ممتاز فرمایا۔ دربار و دعوت تقاریب و سفر و حضر میں اپنی ہمراہی کا افتخار بخشا۔ ۱۳۰۱ھ میں خطاب مختار جنگ اور ۱۳۱۰ھ میں جلال الدولہ بہادر پایا اور بتاریخ ۴ محرم ۱۳۱۹ھ

المختصر رفتہ رفتہ تمام حیدرآباد میں کیا اعلیٰ و کیا اوسط و کیا ادنیٰ اور ہر خاندان میں اونچی دستار کا رواج ہوگیا۔ وضع قدیم پر نہ رہی۔ اصل یہ ہے کہ اونچی دستار یا اونچی ٹوپی یا بڑا شملہ سر پر رکھنے کے بعد چھوٹی دستار یا چھوٹا شملہ سر پر رکھا جائے تو اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنی قدیم وضع کی دستار کو باقی رکھا ہے ان کے سر پر وہی دستار اچھی معلوم ہوتی ہے۔

بہرام الملک مرحوم کی خاندانی دستار پر کلابتونی توڑہ کے تین پیچ متصل رہتے ہیں نواب صاحب مغفور کے چھوٹے داماد نواب بہرام الدولہ بہادر اسی خاندان کے ہیں۔ نواب رکن الملک خان دوران بہادر کی خاندانی دستار پر بھی کلابتونی توڑے کے پیچ ہوتے ہیں مگر مینی دستار پر ان پیچوں میں قلغی رہتی ہے۔ بہادر موصوف ہم جد ہیں میر موسیٰ خاں رکن الدولہ مرحوم کے۔ ان توڑوں کی نسبت بعض عطیہ شاہی سمجھتے ہیں لیکن مولف کا خیال یہ ہے کہ سابق زمانے میں جنگ و جدل اکثر ہوتا تھا اس لئے فولادی زنجیر کے چند پیچ سر کے بچاؤ کے لئے دستار پر لپیٹتے تھے یا آنکہ فولادی زنجیر پر کلابتوں لپیٹ کر دستار پر قایم کرتے تھے اور اس کو اپنا تمغہ قرار دیا تھا۔ جب وہ زمانہ شمشیر زنی کا باقی نہ رہا اور وہ لوگ بھی نہ رہے تو ان کی اولاد نے فولادی زنجیر کو ترک کرکے صرف کلابتونی توڑا بطرز بزرگان خود دستار پر باقی رکھا ہے۔

نواب سر تاج جنگ بہادر خلف محبوب یار جنگ ناظم الملک بہادر مرحوم

سخت عیب تھا اسی وجہ سے ہر سہ برادران موصوف مرحوم نے عمامۂ مذکور کو
اختیار کیا نہیں جا سکا کیونکہ اول او امیہ خیال سب با گیہ تھے دستار سر پر رکھنے تو ممکن
تھا۔ نیز نورالامرا بہادر نے جو سالار سے پہلے آگرہ جو امانت کو پہنچے تھے
وہی دستار امرا و شرفاے دہلی کو اختیار کیا تھا۔ یہاں کی کسی دستار کو سر پر نہ رکھا۔
چنانچہ ان کے پوتے پروتوں میں اب تک وہی دستار مروج ہے۔

بیان لباس خاندان امیر کبیر بہادر۔ از روے نقداد بر جو دولت سرائے
نواب سالار جنگ بہادر میں موجود ہیں شمس الامرا بہادر کلاں کی سفید دستار
جس کی بنی پست قدیم منصبداروں کی طرح تھی نہیں پہنتے تھے آستین ایک
دوخت کی ڈھیلی مگر سرا آستین کا تنگ رکھتے یا ہیں بلکہ اندر بٹ ٹکے ہوئے
ہاتھوں میں زمرد کی سمرنیں۔ عمدۃ الملک بہادر عرف منجھلے میاں رشید الدین خان
بہادر وقار الامرا کی سفید دستار بنی پشت دیوار عقب بند۔ ان کے خاندان
میں درباری لباس جامہ یا نیمہ وغیرہ کا ڈگلا اور گلے میں زمرد کی تسبیح
ہاتھوں میں سمرنیں۔

نواب صاحب مغفور حسب طرز قدیم خاندان اپنے قیام گاہ میں کارچوبی
نوکدار ٹوپی پہنتے تھے۔ جیسی مرشد زادوں کی ٹوپی ہے کہ وہ ایسی ہی ہوتی ہے
علیحدہ ہونے کے لئے اپنی ٹوپی کی نوک میں شکن ڈال کر قدرے جھکا لیتے تھے۔
اور تا دم رحلت وہی ٹوپی کارچوبی پہنتے رہے۔ دراصل یہ ٹوپی قدیم وضع ایرانی ہے

مرحوم ہوئے۔ ان کے فرزند میر ریاضت علی خاں محبوب یار جنگ بہادر بتاریخ ۹ ماہ جمادی الاول ۱۲۶۹ھ متولد ہوئے تو ان کی بھی پرورش یہیں سے ہونے لگی بلکہ ان کے لئے ناز و نعم زیادہ رہے کیونکہ ان کے وقت میں خود نواب صاحب مغفور سا مختار کارخانہ و مدارالمہام سلطنت پرورش فرما و نازبردار تھا۔ مانند اپنے بچوں کے تعلیم و تربیت فرمائی۔ محل نواب صاحب مغفور کو ان سے پردہ نہ تھا۔ لائق بنا کر غفران مکان کی خدمت میں مقرر فرمایا جس کے باعث بعد ازاں ابدی کانک اور مورد عنایات غفران مکاں ہوئے اور گنجانہ و تعمیرات وغیرہ خدمات علاقہ مخاص و خطاب محبوب یار جنگ ناظم الدولہ ناظم الملک بہادر سے سرفرار رہ کر دوم ماہ شوال ۱۳۲۵ھ میں رحلت کی۔ ان کے بعد ان کے فرزند لائق و نکی الطبع کریم النفس نواب سر تاج جنگ بہادر جن کا سنہ میلاد ۱۳۰۳ھ ۱۴ ماہ صفر شب جمعہ ہے خدمات پدری سے بمراحم شاہی منصرمانہ سرفراز و کارگزار ہیں پس فی الحال اس قدر کافی ہے۔ اب اس بیان دستار و بز وغیرہ ملبوس قدما کو پورا کرنا لازم ہے جو باقی رہ گیا ہے۔ واضح ہو کہ عہد وزارت سراج الملک بہادر میں طالب الدولہ بہادر کوتوال اور ان کے بھائی غالب الدولہ بہادر و فیض مآب الدولہ بہادر ایرانی نژاد تھے اس لئے زرین فوردار عمامہ سر پر رکھتے تھے جیسا کہ میرزا علی محمد خاں معتمد الدولہ بہادر مرحوم کے خاندان میں چھوٹے آغا مخاطب بہ معتمد جنگ بہادر مرحوم تک رواج رہا۔ کسی خاندان کی دستار کو اختیار کرنا اس زمانے میں

اور گیہوں کسی محتاج کو دے دیتے تھے جب تک تولی نہ جاتی اس دستار کو سر پر نہیں رکھتے تھے۔

قبل مدار المہامی مغفور اوّل یہاں رومی ٹوپی فقط چند رومیوں کے سر پر نظر آتی تھی۔ ان کے سوائے کوئی نہیں پہنتا تھا۔ اور نہ ایرانی ٹوپی مروجہ حال کا کہیں پتہ تھا۔

دیوار کی نقوہ دار ٹوپی جو اس زمانے میں رواج پائی ہے۔ یہ ٹوپی سابق زمانے میں صرف کم سن لڑکیوں کو پہناتے تھے۔

نواب صاحب مغفور کا نیز دوسرے امرا و شرفا و اہل منصب کا لباس درباری جامہ کے سوائے قبا و کیانی بھی تھی۔ وہ بھی مانند جامہ کے لانبی ٹخنے تک جامہ کے نیچے نیمہ پہننا لازمی تھا۔ نیمہ کی قطع بھی مانند جامہ کے ہوتی ہے لیکن اس کا گھیر مثل جامہ کے زیادہ نہیں ہوتا ہے اور لانبان بھی جامہ سے کسی قدر کم ہوتی ہے۔ آستین ایک دوخت کی سیدھی۔ دو دوخت کی جیسی کہ اب مروج ہے اس کو جانتے ہی نہ تھے۔ اور نہ کوئی خیاط یہاں کا تیس[3] برس کے قبل تک بھی قبا کی ایسی قطع و برید جانتا تھا۔ نیز قدیم امرا سوائے دربار کے خالی اوقات میں بھی دُہتو پہنتے تھے جو کہ مانند قبا کی تھی مگر اس کا بر مانند جامہ کے ایک پر ایک آتا تھا۔ اور اس کے بند بھی مثل جامہ کے ہوتے تھے۔ جس کا ذکر لباس عہد عالمگیر پادشاہ میں کیا گیا ہے۔ نیز چھلوای

اور شکن ڈالنا بھی وہیں کا طرز ہے۔ لیکن وہ اس سے اونچی اور شال وغیرہ پشمینے کی ہوتی تھی مانند یہاں کے کارچوبی نہیں۔

نواب صاحب مغفور ہرگاہ شکار یا سفر وغیرہ میں گھوڑے پر سوار ہوتے تھے اور دھوپ ہوتی تھی تو پیشانی اور آنکھیں دھوپ سے محفوظ رہنے کے لئے حسب طریقۂ اہل ایران یعنی دستار پر یعنی پیشانی پر **قتات** باندھ لیتے تھے مگر سایہ کے واسطے کبھی انگریزی ٹوپی سر پر نہ رکھی۔ قنات سیاہ بانات و مخمل وغیرہ کسی دبیز چیز کا ہلال ہوتا ہے اس کے گوشوں میں دو ڈوریاں ہوتی ہیں۔ اس ہلال کو پیشانی پر کھڑا رکھ کر اس کی ڈوریاں پس سر باہم باندھ لیتے ہیں تو اس ہلال کا سایہ پیشانی اور آنکھوں پر پڑتا ہے۔ اگر آفتاب سر پر ہوتا ہے تو تمام چہرہ بھی اس ہلال کے سایہ میں رہ سکتا ہے۔

عموماً شرفا دربار شاہی میں یا امرا کے پاس یا کسی دعوت وغیرہ میں جانے کے وقت دستار سر پر رکھتے تھے ورنہ شملہ یا ٹوپی سنجافی قطع کی جس کو اہل ایران عرقچین کہتے ہیں۔ یا تاج اپنے گھر میں پہنتے تھے۔ کہیں باہر ٹوپی سے نہیں جاتے تھے تاج مشابہ ہوتی ہے لکھنو کی دوپلڑی ٹوپی سے مگر دوپلڑی چھوٹی ہوتی ہے سالم سر کی نہیں ہوتی اور تاج سالم سر کی ہوتی ہے۔

تمام لباس میں دستار کی عزت زیادہ تھی۔ اگر سر پر سے یا کھونٹی پر سے اتفاقاً دستار گر پڑتی تو اس کو گیہوں کے ساتھ ترازو میں تولتے تھے۔

بطرزِ قدیم تھی۔ موسم سرما میں بنات وغیرہ کا شرفا اپنے گھر میں پہنتے تھے۔ اپنی
اتنا اونچا لباس کہ زانو تک پاؤں نظر آئیں اس کو پہن کر کہیں باہر جانا خلافِ
تہذیب جانتے تھے۔ اگر باہر پہنتے تھے تو انگرکھے کے اوپر۔

نواب صاحب مغفور اتنی اونچی قبا گھوڑے کی سواری کے وقت
پہنتے تھے۔ نیز حسب دستور بزرگان خود دربار جانے کے وقت جامہ پہن کر سفید
بنارسی پٹکہ جس کا متن سادہ اور حواشی زریں ہوتا تھا کمر پر باندھتے تھے اور اس کے
دونوں شملہ گرہ دینے کے بعد سامنے آویزاں رہتے تھے۔ اس پٹکہ پر کلابتو
پڑتلا بھی لپٹا جاتا تھا جس میں تلوار رکھنے کا بکلا نصب رہتا تھا۔ اس پٹکے
میں بوقت سواری اسپ تلوار رکھتے ہیں ورنہ تلوار ہاتھ میں رہتی۔ اور حسب دستور
قدیم کمر میں ایک قرولی بشب بہوری وغیرہ رکھنے کے لگاتے تھے۔

قدیم زمانے میں روسا وغیرہ اکثر بطرز دکھنیاں تلوار سیدھی اور لانبی رکھتے
تھے۔ اس کا قبضہ پر چدار ہوتا تھا یعنی بنی اس کی چوڑی انگلیوں کے بچاؤ کی
غرض سے ہوتی تھی۔ اس قبضہ میں تلوار کا پھل آہنی کیلوں سے جڑا جاتا تھا۔
ایسی تلوار کو دہوپ کہتے ہیں۔ بروزن شوب چونکہ اہل دکن میں بنوٹ یعنی
فن شمشیر کا کمال رواج تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس فن شریف کے اہل دکن
موجد و ماہر تھے۔ مولف نے اپنے استاد مرحوم سے سنا ہے کہ کسی زمانے میں
اس فن کے ایک استاد محمد رسول صاحب نامی دکن سے ہندوستان گئے تھے

جگر اُنی ململ، سیلا، ڈوریہ، آغابانی، کنچی وغیرہ کا گھیر دار انگرکھا پہنتے تھے چنانچہ نواب صاحب مغفور بھی کم گھیر کا انگرکھا عہد شباب میں پہنتے تھے۔ اور آخر زمانے میں قبا کے نیچے پہنتے تھے۔ بعض لوگ باریک انگرکھے کے نیچے کرتہ بھی پہنتے تھے۔ خصوصاً بانکے اور ورزشی جوان باریک انگرکھے کے نیچے آغابانی یا ڈوریہ یا کشیدہ وغیرہ کے کرتے پہنتے تھے۔ ایسوں کے انگرکھے زیادہ گھیر دار اور ٹخنے تک لانبے ہوتے تھے۔ چوبغلہ یعنی ہندوستانی انگرکھا بھی شاذ و نادر پہنا جاتا تھا۔ چنانچہ نواب صاحب مغفور نے بھی گاہے پہنا ہے۔

سابق زمانے میں یہاں موسم سرما میں قلمکار یا کوفی اور چھینٹ وغیرہ کا انگرکھا استر دار اندر روئی دیا ہوا پہنا جاتا تھا جس کو ڈگلا کہتے تھے۔ سوائے بنات کے یہ نویٹ وغیرہ اونی پارچے جو فی زمانہ انواع و اقسام کے مستعمل و مروج ہیں پچاس برس کے قبل ان کے نام سے کوئی واقف نہ تھا۔

نواب صاحب مغفور اوائل عمر میں نیز دیگر امرا و اہل مقدرت موسم سرما میں صوف یا شال یا بانات کا یا جس قلنجانی کا ڈگلا پہنتے تھے۔ جامہ وار انواع و اقسام کے جو فی الحال یہاں مستعمل ہیں ایسے اس زمانے میں نہ تھے۔

اس زمانے کی قبا جس کو شیروانی کہتے ہیں اور وہ دربار شاہی میں پہن کر جاتے ہیں۔ اتنی اونچی قبا تو قدیم لوگ یعنی تیس چالیس برس کے قبل تک بھی قبا نہیں کہتے تھے بلکہ کنچہ کہتے تھے جس کی آستینیں ایک دوخت کی اور قطع اس کی

بطور زیبایش یا بلحاظ لازمہ دربار ہاتھ میں رکھتے ہیں تو خمدار از قسم مغرب
یا حلب یا جُنب یا مصری یا صراحی یا نزہ وغیرہ آہنی جس کو اصیل کہتے ہیں۔
یا عباسی یا خراسانی یا اصفہانی یا قزوینی یا شیرازی وغیرہ جو کہ فولادی جوہردار
ہوتی ہے۔ ان میں جس کو بیبا ہو اوسکو غدّارہ کہتے ہیں۔ ان جملہ تلواروں کے قبضے
اورنگ زیبی۔ حکیم خانی۔ سیف خانی ہوتے ہیں جن پر اکثر طلائی تہ نشان یا
زرنشان یا مُثبت یا کوفت یا کارِ غلامان ہوتا ہے۔

ان کاموں کے جب نام بتلائے گئے ہیں تو لازم ہے کہ ہر ایک کام کی کچھ
کیفیت بھی بیان کی جائے۔

واضح ہو کہ لوہے کے قبضے پر بیل بوٹے کندہ کرکے طلائی تار جو بٹھاتے
ہیں وہ **تہ نشان** ہے۔ طلائی باریک کام جو مُثبت (ابھرا ہوا) ہوتا ہے اس کو
زرنشان کہتے ہیں۔ جس قبضہ پر تہ نشان و زرنشان ہر دو قسم کا کام ہو اُس کو
دوکارہ کہتے ہیں۔ طلائی یا نقرئی وغیرہ بیل بوٹے ابھرے ہوئے بڑے بڑے
ہوں تو وہ **مُثبت** کہلاتا ہے۔ ورق طلائی یا نقرئی سے جو بیل بوٹے کا کام ہوتا ہے
وہ **کوفت** ہے۔ طلائی یا نقرئی ملمع کرکے اس پر بیل بوٹے کے لئے زمین جو خالی
کرتے ہیں یعنی سیاہ بیل بوٹے ہوتے ہیں تو اس کو تہ طلا یا تہ نقرہ کہتے ہیں جس کے
بیل بوٹے میں طلا و نقرہ اور تانبا تینوں شریک ہوتا ہے اس کو **کارِ غلامان**
کہتے ہیں بعض قبضوں پر صرف طلائی یا نقرئی ملمع ہوتا ہے سادہ یعنی کوئی

نوان سے وہاں کے بعض لوگوں نے یہ فن کسی قدر حاصل کیا تھا۔ المختصر اس فن کے لئے سیدھی تلوار مناسب ہے اس لئے اکثر اہل دکن سیدھی تلوار رکھتے تھے اور جنگ وجدال اکثر واقع ہوتا تھا۔ اس وجہ سے ان کی تلواریں بلحاظ مضبوطی آہنی کیلوں سے قبضوں میں جڑی جاتی تھیں لاک سے قبضہ میں تلوار جڑنے کو وہ تجربہ کار لوگ ناپسند کرتے تھے کہ اس کا اعتبار نہیں عین شمشیرزنی میں تلوار قبضے سے علحدہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ اس زمانے کی تلواریں جو فی الحال اورنگ زیبی وغیرہ قبضوں میں جڑی ہوئی ہیں ان میں قریب دنبالہ کیلوں کے سوراخ نمایاں ہیں اگرچہ چاندی وغیرہ سے وہ سوراخ بھر دیے گئے ہیں۔

قدیم دکھنیوں کی ایسی ہی سیدھی لانبی ایک اور تلوار ہوتی ہے جس میں بجائے قبضہ کہنی تک آہنی دستانہ نصب رہتا ہے۔ اس کی گرفت مانند کٹار کے ہوتی ہے۔ ایسی تلوار کو پیٹا کہتے ہیں۔ اس کے پھل کو اکثر پیٹ نہیں ہوتی بلکہ ہر دو طرف دھار ہوتی ہے جس کو سیف کہتے ہیں۔ نیز ایک اور سیدھی تلوار ہوتی ہے جس کا سر نوکدار نہیں ہوتا بلکہ چپٹا اور مدوّر و تیز ہوتا ہے۔ قبضہ اس کا مانند دھوپ کے ہوتا ہے۔ ایسی تلوار کو کھانڈا کہتے ہیں۔ اس کا استعمال اکثر مرہٹوں میں تھا۔

فی الحال یہاں کے امراو شرفا وغیرہ ثقہ لوگ سیدھی تلوار بہت کم باندھتے ہیں۔ اگرچہ عموماً تلوار کو بیکار تصور فرماتے ہیں۔ مگر دربار وغیرہ میں گاہے

فرد کاند ہے پرڈالے کے عموماً باہر نکلتے نہ تھے۔ یہ رومال جوڑا چار یا پانچ ہاتھ کا طول اور دو ڈھائی ہاتھ کا عرض سوتی سُرخ سیاہ وغیرہ جو خانہ انواع واقسام اسی ملک کے تعلقات میں یعنی دیورکنڈہ ۔ چریال ۔ نلگنڈہ ۔ وغیرہ میں بُنا جاتا ہے۔
نواب صاحب مغفور نے سوائے پیراہن کے انگریزی قمیص کبھی نہیں پہنا۔ اور پاجامہ چہلواری کا دوہرا محرابی قطع کا بغیر کلیوں کے اپنے قیام گاہ وغیرہ میں اکثر پہنتے تھے۔ رزیڈنسی یا اور کہیں باہر جانا ہوا تو فلالین وغیرہ کا پتلون نما پاجامہ بھی پہنتے تھے جس کو مغلائی ازاربند ہوتا تھا۔ جامے کے ساتھ جو پاجامہ پہنا جاتا ہے اس کو **تُنبان** کہتے ہیں۔ مشروع یا بنارسی گلبدن کا اکھیرا ہوتا ہے۔ ہر پائچہ تقریباً آدھے وار عرض کا چنانچہ **نواب صاحب مغفور** بھی جامے کے ساتھ تنبان پہنتے تھے۔ تنبان سے کسی قدر چھوٹے پائچوں کا پاجامہ یعنی ہر پائچہ تقریباً ایک فٹ عرض کا جو ہوتا ہے اس کو **فیلپایہ** کہتے ہیں۔ چہلواری کا یا سلائیدار کسی بھی پارچہ کا اکھیرا ہوتا ہے۔ سابق زمانے کے مرشدزادے وغیرہ ثقہ لوگ پہنتے تھے۔ اس سے ذرا کم پائچوں کا سفید پاجامہ مگر اونچا یعنی ٹخنے تک شرعی کہلاتا ہے۔ ایسا پاجامہ زاہد وعابد متشرع پہنتے تھے۔ نیز چہلواری کا دوہرا پاجامہ جس کو گرگی کہتے تھے عام طور پر مستعمل تھا۔ **جوڑیدار پاجامہ** اریب کا اعلیٰ وادنیٰ کوئی نہیں پہنتا تھا۔ ہندوستان کے گویوں کا لباس ہے کہتے تھے۔

بیل یا بوٹہ نہیں ہوتا ہے اس کو ملمّع کار کہتے ہیں۔

الحاصل قبضہ ہائے مذکور مینی دار بھی اور بغیر مینی کے بھی ہوتے ہیں جن میں تلوار کے پھل لاک سے جڑتے ہیں۔ نواب صاحب مغفور بھی اسی قسم کی تلوار حسب رواج زمانہ دربار شاہی میں رکھتے تھے۔ جمعداران و سپاہ پیشہ دربار جانے کے وقت عموماً انگرکھا پہن کر کمر پر بڑا پٹکا باندھتے تھے اور اس میں پیش قبض کٹار تپنچے وغیرہ لگاتے تھے اور کلابتونی یا چرمی پٹا جس کو علی بند کہتے ہیں حمایل کرتے تھے جس میں تلوار کا بچا اور اس میں تلوار پڑی رہتی تھی۔ پشت پر بڑی سپر لگی ہوئی رہتی تھی۔ سابق زمانے میں علی بند حمایل کرنا روسا و امرا کا بھی عموماً دستور تھا۔

رسالداروں اور جمعداروں کی دستاریں یا تینی پیچی پگڑیاں مختلف وضع کی تھیں اور ہنوز ہیں۔ پٹکا چھوٹا ہو یا بڑا کمر پر باندھنا عموماً دستور دربار تھا۔ جیسا کہ اس زمانے میں فقط لنگوس کمر پر لگا لینا اعلیٰ و ادنیٰ سب نے اختیار کیا ہے سابق زمانے میں ایسا جائز نہ تھا۔ سابق زمانے میں عموماً جامہ و قبا وغیرہ کے اوپر موسم سرما وغیرہ میں دوشالہ یا شالی رومال اوڑھتے تھے۔ غیر موسم سرما میں بنارسی یا ناندیڑی یا سادہ سفید رومال باریک اوڑھتے تھے۔ چنانچہ خاندان لالہ بہادر میں ہنوز اس کا رواج ہے۔

دوشالہ مستطیل شالی دو چادروں کا ہوتا ہے رومال شالی وغیرہ مربع ہوتا ہے اور مثلث تہہ کر کے اوڑھتے ہیں۔ انگرکھا پہن کر بغیر رومال کا جوڑا یا

یہ سلیم شاہی وغیرہ ہندوستان کا جوتا بھی ثقہ لوگوں کے نزدیک معیوب تھا چینے والوں کا جوتا ہے کہتے تھے۔ ہندوؤں کے جوتے عموماً سرخ نری کے دیہات کے بنئے ہوئے اور سرخ ریشم کا کام پنجوں پر ہوتا تھا۔

اہل اسلام اعلیٰ و اوسط اپنے بچوں کو تقریباً دو تین سال تک سفید پاجامہ پہنانا پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ مشروع یا اطلس یا سرخ مدرہ وغیرہ کی حسب مقدرت رنگین تنبان پہناتے تھے۔

مصالح کناری گوٹہ ٹانک کر رنگین تاج یا گول ٹوپی یعنی عرقچین یا کان ٹوپی اطلس و کمخواب وغیرہ کی حسب استطاعت پہناتے تھے۔

سابق زمانے میں یہاں کے مستورات شرفا انگیا یا چولی ململ کی پہننے والی پہننا معیوب جانتے تھے۔ اگر پہنتے بھی تھے تو اس پر ململ وغیرہ کا دے کر اور کرتی کوتاہ یعنی کمر سے کچھ نیچے۔ شادی وغیرہ تقاریب میں یہ پیشواز پہنتے تھے۔ شوہر دار رنگین اور بیوہ سفید۔ اوڑھنی سر پر سے سرکنے نہیں دیتے تھے یعنی کھلے سر رہنا ممنوع و معیوب جانتے تھے۔

ادنیٰ درجہ والوں کا لباس علیحدہ تھا۔ شاگرد پیشہ و فراش و اہل حرفہ وغیرہ جملہ انگرکھا ملکے کپڑے کا پہنتے تھے اور پگڑی تین پیچی یا کوئی اور وضع کی سرخ وغیرہ رنگین۔ پٹکا یا رومال سے کمر بندھی ہوئی۔ لیکن دستار و قبا سوائے شرفا کے دوسرا کوئی ہرگز نہیں پہن سکتا تھا اگرچہ مال دار ہوتا چنانچہ کوئی

پاتابہ پہننے کا سابق زمانے میں دستور تھا نہ پاتابے ہر ایک کو دستیاب ہوتے تھے۔ بعض اہل مقدرت کو ایرانی وغیرہ پاتابے میسر ہوتے تھے تو موسم سرما میں فقط اپنے قیام گاہ میں پہن لیتے تھے دربار میں پہن کر نہیں جاتے تھے۔

نواب صاحب مغفور سُرخ زری کا دیسی جوتا چونچ دار پہنتے تھے۔ اس کا سر خمیدہ نہیں ہوتا تھا۔ ایڑی پست اور اندر سُرخ مخمل منڈھا ہوا۔ دربار میں بھی وہی جوتا پہن کر جاتے تھے عموماً ثقہ لوگ ملکی سرخ زری کا جوتہ جس کو آپا شاہی کہتے ہیں پہنتے تھے۔ خواہ اپنے گھر میں خواہ دربار میں وہی ایک قسم کا جوتا تھا۔

گھوڑے کی سواری کے لئے چرمی موزے زانو تک پہنتے تھے۔

جوان اور بانکے لوگ زیر پائی زرد یا سرخ وغیرہ مخمل کی یا کمخواب یا کیمخت کی یا کارچوبی کام کی یا سادی سرخ زری کی پہنتے تھے۔ زیر پائی کی ایڑی میں نعل ہوتی ہے اور اس کا سر نہایت خمیدہ ہوتا ہے۔ پہنو تو پاؤں کی انگلیاں فقط اس میں جاتی ہیں اور نصف سے زیادہ ایڑی باہر رہتی ہے۔

اس زمانے کا زنانی جوتا عموماً سرخ زری کا یا مخمل کا یا کارچوبی وغیرہ مثل آپا شاہی کے تھا مگر اس کا سر آپا شاہی سے زیادہ اونچا اور خمیدہ۔ ایڑی بھی اونچی۔ ایسا ہی زنانی جوتا کارچوبی کام کا جلوہ کے روز نوشاہ بھی عموماً پہنتے تھے۔ انگریزی جوتا بوٹس یا پمشوز وغیرہ پہننا تو گویا کفر تھا۔

شربت خوری ہوتی تھی یعنی چھوٹی سی گلاس میں مصری کا شربت انہیں پلایا جاتا تھا۔ شربت پینے کے وقت ہر ایک شخص دو روپے یا ایک روپیہ یا اٹھنی حسب امکان گلاس شربت کی تھالی میں رکھ دیتا تھا۔ اسی طرح زمانے میں بھی۔ اب وہ شربت خوری عموماً نہیں رہی مگر بعض شادیوں میں صرف جلوہ کے روز بعد عقد خوانی نوشاہ کو اور پدر و برادر حقیقی کے لئے ہوتی ہے۔

کیسا ہی کم استطاعت آدمی ہوتا بغیر رسم ساچق و حنابندی و شبگشت کے اس کی شادی ہوتی نہ تھی۔ یعنی یہ تینوں نفر ہیں تین روز میں ادا ہونا واجبات سے تھا۔ فقط ایک شب و روز کی شادی ناپسند و معیوب تھی۔ شب گشت نصف شب کو ہوتا تھا۔ عقد خوانی اور جلوے سے فارغ ہوکر قبل طلوع آفتاب تاروں کی چھاؤں میں اکثر بازگشت ہو جاتی تھی۔ کسی کی بازگشت ذرا دن چڑھے ہوتی تھی تو سب کہتے تھے بڑی دیر ہوگئی۔ تیس چالیس روپے ماہوار دار تک بھی اپنی شادی میں اقلاً ایک دو خوانی تورہ تقسیم کرتا تھا۔ ذی مقدرت کی شادی میں سات خوانی یا پانچ خوانی تورے تقسیم ہوتے تھے۔ نامی گرامی بڑے امیر و وزیر دولتمند کی شادی میں گیارہ خوانی یا تیرہ بلکہ اکیس خوانی تورے تقسیم ہوتے تھے۔ ایسا تورہ کسی غریب منصبدار کے گھر آتا تھا تو اس کا گھر کھانے کی چیزوں سے بھر جاتا تھا اور وہ شخص بسبب افراط اغذیہ اس میں سے اپنے ہمسایہ میں اور عزیزوں کو تقسیم کرتا تھا اس کے گھر میں اس روز گویا شادی کی

شریف وسنار تو کجا اپنی کہنہ قبا بھی کسی شاگرد پیشہ وغیرہ کو عطا نہیں کرتا تھا کہ ہمارا لباس ہمہ و پہن نہیں سکتا ہے۔

الحاصل سابق زمانے میں اعلیٰ و ادنیٰ کے لباس میں بلکہ ہر فرقہ و ہر پیشہ ور کے لباس و پگڑی میں فرق ہوتا تھا جس سے صاف معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ شخص فلاں پیشے کا ہے۔

مسلمان اور ہندو انگرکھے سے پہچانا جاتا تھا یعنی مسلمان کے انگرکھے کی گھنڈی دکمہ بائیں طرف ہوتا ہے اور ہندو کے انگرکھے کا داہنے جانب۔ معمار۔ نجار۔ زرگر۔ آہنگر۔ صراف خیاط وغیرہ کے انگرکھے کھادی وغیرہ موٹے کپڑے کے کمر تک ہوتے تھے اس سے زیادہ لانبے نہیں۔ عید کے روز یا شادی وغیرہ میں زانو تک لانبا انگرکھا پہنتے تھے۔ قدیم لباس بتلایا گیا ہے تو لازم ہوا کہ مختصر سا حال ان قدیم تقاریب کا بھی بیان کیا جائے جو متروک ہو گئے اور ہونے کو ہیں۔

واضح ہو کہ بزمانہ سابق تقریب بسم اللہ خوانی میں لڑکا یا لڑکی بسم اللہ پڑھنے کے بعد اس کے ہاتھ میں جملہ اقارب و احبائے مدعو فرداً فرداً حسب مقدرت روپے یا اشرفیاں رکھتے تھے۔ علیٰ ہذا القیاس زنانے میں مستورات بھی دیتی تھیں۔ چنانچہ خاص خاص عزیز و اقارب اب بھی دیتے ہیں۔ شادی میں ہمراہی رسم جو طرف ثانی سے آتے تھے یا ہمراہ نوشہ جو رہتے تھے اُن کی

دعوت کر کے طعام شادی کھلاتے کا طریقہ رفتہ رفتہ تمام بلدے میں جاری ہوگیا۔

شادی وغیرہ تقریب میں مہمانوں کو وقت رخصت پھولوں کے دو ہار گلے میں ڈالتے تھے ایک ہار دینا معیوب تھا۔ اگر پھول گراں رہتے یا کم استطاعتی ہوتی تو گلاب کی پتیوں ہی کے سہی مگر ہاروں کا ہونا لازمی تھا۔ اور پاندان یعنی ایک کشتی میں سات تشتریہ پان مصالح کی۔ الائچی۔ چھالیہ۔ چکنی ڈلی۔ جوز۔ جوتری۔ لونگ کتھا۔ اور حسب امکان پچاس یا اس سے کم و زیادہ پان ہر ایک مہمان کو پیش کرتے تھے۔ مہمان وہ سب مصالح خالی کر لیتا تھا۔

ابّن صاحب والد مرزا ثابت علی مرحوم نے جو ایک تاجر شخص تھے بنظر تخفیف تصدیع و تقلیل مصارف الائچی اور چھالیہ وغیرہ ہر ایک شۓ مصالح کی جدا جدا پوڑا باندھ کر سرخ یا زرد کاغذ کے مستطیل کیسے میں جملہ پوڑیاں ڈالدیں۔ وصفیہ اور قہوۂ خام کی دو پوڑیاں بھی شریک کیں تاکہ کیسۂ مذکور کا ابھار اور وزن کسی قدر بڑھ جائے۔ اور کیسے کا منہ بند کر کے پان کے ساتھ تقسیم کئے۔ کیسہ پوڑا کہلاتا تھا۔ اس کا رواج کئی سال رہا۔ جب کشتیاں مروج ہوئیں تو وہ کاغذی کیسے تفصیلی آدمیوں کو یعنی مہمانوں کے ملازمین وغیرہ کو دینے لگے۔ کشتیوں کا بانی و موجد معلوم نہ ہوا مگر اس کی کیفیت یہ کہ ٹین کی کشتی مربع مستطیل خانے دار بنوائی گئی ان خانوں میں مصالح مذکور ڈالنے کے بعد سرخ پارچے میں کشتی کو لپیٹا اور اس پر سرخ پارچہ کا تورہ پوش

بوآئی تھی۔ بہر حال تقسیم طعام شادی واجبات سے تھی۔ سابق زمانے میں بعض دولتمندوں کی شادی میں خوان۔ جھیبے پستنی۔ نورہ پوش سمیت نورے تقسیم ہوئے ہیں یعنی مزدوروں نے سر پر سے خوان اتار دئے اور چلے گئے۔
چنانچہ پچاس برس کے قبل ایک چودھری چوبینہ فروش پالے صاحب نام ساکن رزبدلنسی نے بھی اپنے پسر کی شادی میں نورے مع خوان وغیرہ تقسیم کئے اور مزید برآں یہ تکلف کیا کہ بجائے سفالی ہر نورے میں نو عدد ظروف مسی قلعی کئے ہوئے تھے۔
سنہ ۱۳ھ میں نواب رکن الملک خان دوران بہادر نے اپنی صبیہ کی شادی میں کئی روز تکلف سے دعوت کر کے جملہ اقارب و احباب کو اگرچہ عمدہ کھانے کھلائے مگر چونکہ بہ نسبت دستور قدیم امرا میں یہ نئی بات تھی تو لوگوں میں چرچے ہوئے۔ جو ناواقف تھا وہ کہتا تھا کہ ایسے بڑے امیر ہو کر نورے تقسیم نہ کئے۔ جو واقف تھے وہ کہتے تھے کیا کریں گے نواب قرضدار و زیر بار ہیں۔
تخمیناً چالیس برس کے قبل قوت جنگ مرحوم نے اپنی صبیہ کی شادی میں رسم حنابندی کو خلاف دستور قدیم بوقت عصر روانہ کیا لہذا چرچے ہوئے کہ کیا کفایت شعاری ہے۔ مصارف روشنی سے بچنے کے لئے دن کو مہندی نکالی ہے۔ بسبب خلاف عادت ہونے کے چند روز چرچے تو رہتے ہیں لیکن کفایت کا کام جلد پسند آجاتا ہے چنانچہ جب سے دن کو مہندی روانہ کرنے کا اور بعوض نوروں کے

اکثر سید ھے اور وضع کے پابند تھے۔ اور جھوٹی قسم کھانے کی جرات تو عوام الناس میں بھی بہت کم تھی۔ اکثر مخلوق ہتیار بند تھی حتّیٰ یہ کہ بعض سائیس اور بھوئی یعنی کہار بھی سواری کے وقت ایک خمدار چھری خاص وضع کی جس کو نرٹپ کہتے ہیں کمر میں لگا لیتے تھے۔ نشہ باز خصوصًا مسلمانوں میں کے سیندھی پینے پینے بوڑھے ہوتے تھے مگر شراب کو بہت بد چیز جانتے تھے اور نہایت گناہ کا کام اور سخت مضر سمجھ کر پرہیز کرتے تھے۔ قدیم لوگ رواج قدیم کے پابند رہتے تھے اگرچہ حکم شرع سے نہ ہو۔ چنانچہ خوندانیں اپنے دامادوں سے عموماً پردہ کرتی تھیں۔ بعد انتقال برادر زوجۂ برادر کے ساتھ عقد کرنا نہایت ناجائز جانتے بلکہ اب تک بھی انہیں طبایع کا اثر ہے۔ جو شخص کسی عورت کو بہن کہہ دیتا تو اس کا لحاظ عمر بھر رکھتا تھا۔ جس دختر کی صرف نسبت ٹھہرتی با آنکہ کوئی رسم ابتدائی منگنی وغیرہ ادا ہوتی اور بعد ازاں قبل شادی وہ منگیتر اگر مر جاتا تو پھر اس دختر کی شادی کسی دوسرے سے نہیں کرتے تھے بلکہ اس کو عمر بھر کے لئے بیوہ بنا کر بٹھا دیتے تھے۔

سابق زمانے کے شرفا میں ناکتخدا لڑکیوں کے بیٹھنے کا مقام سب سے علحدہ کنارے معین رہتا تھا۔ کشیدہ وغیرہ دوخت کے کام میں مشغول رہتی تھیں۔ کسی کے پاس کی ماما وغیرہ باہر کی عورتیں آتیں یا مہمان مستورات آتی تھیں اور گھر کی بی بیوں سے جو کچھ بات چیت باہم ہوتی تھی اور اہل زمانہ کی بھلی بری

نقرئی چھوٹی کرن ٹکی ہوئی اُڑھایا گیا۔ اور عطر کی چھوٹی سی شیشی اور پان کے ساتھ دینے لگے۔ ایک مدت یہ خوشنما کشتی اکثر تقاریب میں جاری رہی۔ بعد ازآں ڈاکٹر مرزا علی خاں حکیم الحکما مرحوم نے سنہ ۱۳۰۰ھ میں اپنے فرزند میر عباس حسین کی شادی میں ٹین کی کشتی عمدہ ڈھکنے دار تقریباً آدھ گز طول ایک فٹ عرض کی۔ ایک طرف زر مادے دوسرے طرف کنڈہ بند کرنے کا کسی اچھے کارخانے میں بنوائی اور اس کشتی پر رنگین نقشی کاغذ ولائتی چسپاں کیا۔ اس میں اشیائے مصالح کے ساتھ ایک ڈبیہ نقرئی تخمیناً چار ماشہ وزنی اس میں عطر کا پاھار رکھا۔ اور وہ کشتیاں پان کے ساتھ تقسیم کیں۔

یہ کشتی بہ نسبت کشتی مذکور کے جو آسان نظر آئی تو اسی کی تقلید شروع ہوئی مگر صرف ٹین کے ڈبے یہیں کے بنے ہوئے کہیں بڑے کہیں چھوٹے یا مصالح مذکور عطر کی شیشی مع پان تقسیم ہونے لگے۔ بعضوں نے آئینہ دار وغیرہ بنوائے۔ تاآنکہ وہ بھی موقوف ہوکر صرف انگریزی ڈبیہ ٹین کی قدرے الایچی اور چکنی ڈلی بجائے ہار ایک گلدستہ جس کو یہاں پھول لنگی کہتے ہیں دیتے ہیں وہ بھی متوسطین ورنہ متمولین تو وہ بھی نہیں۔

جب لباس و تقاریب اہل زمانہ سابق کا بیان ہوا ہے تو ان کے تھوڑے خصائل وغیرہ کا ذکر کرنا بھی لازمی ہوا۔

واضح ہو کہ زمانۂ سابق کے لوگ خصوصاً شرفا جھوٹ کہنے کے عادی نہ تھے۔

مردوں کے لئے ہاتھی ۔ گھوڑا ۔ میانہ کے سوائے کرسی میانہ بھی مروج تھا جو کہ بطور کرسی کے ہوتا ہے اس پر فقط مربع چھت ہوتی ہے ۔ بعض بغیر چھت کے بھی ۔ ٹاپ بھی بطور کرسی میانہ کے ہوتی ہے مگر اس پر ٹاپ مانند فٹن گاڑی کے ہوتی ہے خواہ اس کو چڑھا دیں یا اتار دیں ۔ پنس مثل میانہ کے ہوتی ہے مگر میانے سے کسی قدر بڑی اور سنگین ۔ اس کا ذکر مفصلاً واقع دربار عید الفطر میں ۱۲۹۲ھ میں آئے گا جس کو انگلستان سے عالم پناہ کے لئے گورنر جنرل بہادر نے کلکتہ سے تیار فرما کر بھیجا تھا ۔ بعد ازاں یہاں کے امرائے عظام نے بھی ویسا ہی بنوا لیا ۔

انگریزی گھڑیال طاقچے وغیرہ میں رکھنے کی یا جیبی گھڑی سابق زمانے میں نام کو نہ تھی ۔ سو برس کے آگے شاذ و نادر رئیس و وزیر کے پاس شاید آئی ہوگی ورنہ رئیس و وزیر و امرائے اعظم کے پاس عموماً گھڑیالی ملازم تھے ۔ گھڑیالی کے پاس ریتی اور شیشی کی گھڑیال رہتی تھی اس کے حساب سے روز و شب کی گھڑیوں اور پہر کی خبر باآواز بلند دیتا تھا ۔ سواری کہیں گئی تو گھڑیالی بھی ہمراہ رہتا تھا اور وقت معینہ پر اپنا فرض منصب ادا کرتا تھا ۔ مثل نوبت اور روشن چوکی وغیرہ کے یہ گھڑیال بھی سامان امارت میں داخل ہے ۔ چنانچہ بڑے امیروں کی سرکار میں ہنوز وہ گھڑیالی موجود و ملازم ہیں اگرچہ اب وہ بیکار ہیں ۔ نیز پانی اور کٹورے کی گھڑیال بھی امرا کی ڈیوڑھیوں پر ہوتی تھی اسی کے حساب سے پہر سی گردے کو یعنی گھڑیال جو

کیفیتیں بیان کی جاتی تھیں اس سے ناکتخدا لڑکیاں بالکل مطلع ہونے نہیں پاتی تھیں۔ اور ناکتخدا لڑکیوں کو کسی شادی وغیرہ تقاریب میں بھی نہیں بھیجتے تھے لہذا وہ لڑکیاں کتنے ہی سن کی کیوں نہ ہوں زمانے کے صفات مذموم یعنے جھوٹ سخن سازی غیبت۔ مکر و فریب وغیرہ سے محفوظ و بے خبر رہتی تھیں۔

عروس و نوشہ اپنے والدین وغیرہ بزرگوں کے روبرو باہم بات چیت نہیں کرتے تھے۔ اور یہ لحاظ اکثر صاحب اولاد ہوئے تک رہتا تھا۔ جب اولاد ہوتی تھی تو بزرگوں کے سامنے اپنے طفل کو گود میں لینا یا پیار کرنا بے شرمی سمجھتے تھے۔ مستورات شرفا کے لئے نہایت گاڑھا پردہ تھا۔ چنانچہ منس یا رتھ میں کہ زنانی یہی دو سواریاں تھیں خصوصاً جب کبھی بیرون شہر کسی قدر دور جانا ہوتا تو منس یا رتھ کے اصلی پردہ پر اکتفا نہ کر کے اس پر چاندنی یعنی سفید گاڑھا کپڑا لپیٹ کر سوتی رسیوں سے کستے تھے۔ غریبوں کے لئے کرایہ کی ڈولی یا چھتری میانہ یا برقع کی گاڑی تھی۔ برقع کی گاڑی دو چاک کی ہوتی تھی اور دو بیل اس کو کھینچتے تھے۔ اس پر موٹے پارچے کی دوہری پوشش ہوتی تھی اس کو برقع کہتے تھے۔ اس گاڑی میں گھنگرو لگائے جاتے تھے جس کے باعث بوقت رفتار آواز ہوتی تھی خصوصاً جب پتھر گٹی پر سے گزر ہوتا تھا تو دور ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ برقع کی گاڑی جا رہی ہے۔ بعض رتھ میں بھی گھنگرو ہوتے تھے مگر نازک آواز کے۔

بیانِ عدم صفائی وغیرہ زمانۂ سابق

قبل مدار المہامی مختار الملک مغفور اوّل بمقام دروازۂ افضل گنج فصیل کہنہ تھی۔اس کے اندر جانب غرب جو فی الحال حیدر نواز جنگ مرحوم کی بنائی مارکٹ ہے وہاں بہت عمیق گڑھا دہلی دروازے تک تھا۔اندرون جملہ شہر پناہ کہیں چند مکان کہیں ویرانہ زمین افتادہ تھی۔کہیں زراعت بھی ہوتی تھی۔اسی طرح بلدہ میں اکثر مقام غیر آباد تھے۔بعض کم آباد محلوں میں بڑے بڑے عمیق گڑھے تھے جن میں کچرا کوڑا ڈالا جاتا تھا۔بارش کا پانی ان میں جمع ہو کر عفونت ہوتی تھی۔نیز بڑی بڑی بعض باؤلیاں ویران وخستہ حال تھیں جن کا پانی استعمال نہیں کرتے تھے۔

جملہ محلوں کی گلیاں تنگ اور غلیظ تھیں۔مکانات کی موریوں کا پانی باہر بہتا ہوا۔جا بجا کچرے کوڑے کے انبار۔کیونکہ اس زمانے میں صفائی کی بنڈیاں کہاں تھیں جو کچرا کوڑا روزانہ اٹھالیجائیں۔پس لامحالہ ہر ایک مکان کا کچرا کوڑا اسی گلی میں کے گھوڑے پر ڈالا جاتا تھا۔

شاہراہ پر جو مکانات واقع تھے ان کی موریوں کا بھی پانی راستے پر بہتا تھا۔کیونکہ شاہراہ کی سرکاری پختہ موریاں نہ تھیں۔اکثر مکانات میں سنڈاس تھے۔سوائے امرا کے مکانات کے کہ وہ گچ کے تھے باقی جملہ مکانات خواہ کوچوں میں کے

آویزاں ہوتا ہے موگری سے بغرض اطلاع عام بجاتے تھے مگر وہی گھڑیاں
اور پہر ۔ گھنٹے اور منٹ کے نام سے بھی کوئی آگاہ نہ تھا ۔

راستے کی طرف ہوتی تھی تو اس کی سفال وغیرہ کا فیصلہ ہو جاتا تھا۔ اگرچہ اس میں فیلبانوں کی مخموری اور شرارت بھی شریک تھی لیکن تنگی شاہ راہ کی وجہ سے ہی انھیں شرارت کا موقع ملتا تھا۔

اس تنگی راہ پر طرفہ یہ تماشا تھا کہ نٹ جن کو یہاں گاروڑی کہتے ہیں۔ نیز پہلوان وغیرہ بازیگر جہاں چاہتے تھے عین راہ میں تماشا بتلانے کو بیٹھ جاتے تھے۔ اور تماشا بینوں کے ہجوم سے راستہ مسدود ہو جاتا تھا۔ رہگذر خصوصاً گھوڑا۔ میانہ۔ رتھ۔ بنڈی وغیرہ کو بدقت وہاں سے گزرنا ہوتا تھا۔ نیز رفاعی فقیر خصوصاً جو دوکاندار پیسہ دینے میں انکار کرتا تھا تو اس کی دوکان پر گھنٹوں اڑے رہتے تھے۔ ضرب لگاتے تھے یعنی زبان کاٹ لیتے تھے۔ آنکھ نکال لیتے تھے۔ یہ دیکھنے کو بھی مجمع لوگوں کا ہو جاتا تھا۔

بعض فقیر بھیڑیئے بعض ریچھ کو۔ بعض شیر کو دو طرف سے رسیاں تھامے ہوئے اور ہاتھوں میں فقیروں کے لوہے کے کڑے۔ ہر ایک دوکان پر بجاتے ہوئے کھڑے رہتے تھے۔ جب پیسہ لیتے تھے تو دوسری دوکان پر جاتے تھے۔ یہ دیکھنے کو بھی بچے اور بڑے جمع رہتے تھے۔

چارکمان اور چارمینارہ کی طرف کے راستے اس قدر تنگ نہ تھے تو بھی ایسے تھے کہ چاروں کمانوں کی کرسی کے آگے ایک ایک ملگی کمان کے اندر بھی تھی۔ اس پر وہاں کی وسعتِ شاہراہ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

خواہ سر راہ کے ان پر چونا نہیں پڑتا تھا یعنی سفید کاری مدتوں نہیں ہوتی تھی۔ محرم کا مہینہ آیا تو عاشور خانوں میں سفید کاری ہوتی تھی۔ یا آنکہ جس مکان میں شادی وغیرہ ہوتی تھی اس کی سفید کاری ہوتی تھی۔ اس کے سوائے نہیں اگرچہ برسوں گزر جائیں۔ اس وجہ سے کوچے وغیرہ اکثر بدرونق تھے۔ شاہ راہ میں اکثر پتھر گٹی یعنی پتھروں کا فرش ناہموار تھا۔ زمانۂ دراز کے مرور و عبورِ مخلوق سے پتھر گھس کر اس قدر صاف ہو گئے تھے کہ انسان اور چار پایوں کے پاؤں خصوصاً موسم بارش میں پھسل جاتے تھے۔ کہیں شاہ راہ بغیر فرش سنگ کے تھی لیکن پست و بلند۔ جا بجا کیچڑ۔ عام شاہ راہوں کی تنگی کا یہ حال تھا کہ دو بنڈیاں یا دو رتھ ایک ادھر سے اور ایک ادھر سے۔ تو ان دو میں سے جس کسی کو ذرا کشادہ مقام ملتا تو وہاں اپنی بنڈی یا رتھ کو ہانکنے والا روک لیتا تھا تا کہ دوسری بنڈی وغیرہ جو سامنے سے آرہی ہے بازو سے گزر جائے اور ٹکر نہ ہو۔ جس وقت کڑبی سے لدا ہوا ہاتھی گزرتا تھا تو اکثر مقاموں پر اس ہاتھی سے راستہ بھر جاتا تھا۔ اور مقابل سے کوئی گھوڑا یا میانہ وغیرہ آتا تو اس کو واپس ہو کر کسی گلی میں یا قدرے کشادہ مقام پر جا کر ٹھہر جانے کے سوائے کوئی چارہ نہ تھا دوکان دار ویسے ہاتھی کی آمد دیکھ کر اپنی ٹٹیاں وغیرہ سائبان دوکان پر کی جلد نکال لیتے تھے اور جو نکال لنے نہیں پاتا تھا اس کی ٹٹی اور سائبان کڑبی کے صدمے سے ٹوٹ پھوٹ جاتے تھے۔ جس مکان سفالی کی اونی

چمار لوگ جوتے بیچنے وہاں بیٹھتے تھے اس لئے جلو خانہ موصوف کا چھوٹا دروازہ شمال رویہ چماری دروازہ مشہور ہو گیا تھا چنانچہ اب تک بھی بعض قدیم لوگوں کی زبان پر اس دروازہ کا وہی نام آجاتا ہے۔ الغرض چماروں کے بیٹھنے کا چبوترہ اور اس کے عقب کا لاڈ بازار یہ ہر دو چماری دروازے سے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ بعہد وزارت نواب صاحب مغفور توسیع شاہراہ میں وہ ہر دو نکالدیے جانے سے قدیم دروازۂ موصوف راستے پر آگیا ہے اور یہ توسیع شاہراہ کی ایک جانب سے نہیں بلکہ حسب ضرورت ہر دو جانب سے ہوئی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس چارمینارہ کی ہر دو شاہراہیں ویسی ہی تنگ تھیں کہ شاہراہ میں کے دو جانبہ ملگیات چبوترے اور سائبان ہمیت منہدم کر دے گئے ہیں تب کہیں ایسا وسیع راستہ قرار پایا ہے اور ملگیات پختہ عہد قطب شاہان جو شاہراہ جانب جنوب و شمال میں باقی اور چھپی ہوئی تھیں وہ باہر نکل آئی ہیں۔ پس اس حساب سے سابق شاہراہوں کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس وسعت کی تھیں راستے ناہموار۔ کچرا کوڑا جا بجا پڑا ہوا کیوں نہ ہوتا محکمہ صفائی کا وجود ہی جب نہ تھا تو انتظام صفائی کیسا۔

چوک میں اب جہاں گھڑیال اور چمن بندی ہے وہاں ایک چبوترہ ابن مشہور کرامت شاہ کی قبر تھی۔ روال سوسی۔ کھادی وغیرہ بیچنے والے اور ہتیار بیچنے والے کھلے میدان میں دوپہر سے دوکانیں لگاتے تھے۔ پرندہ فروش میر شکاری بھی ایک طرف بیٹھتے تھے۔ بیچ میں سے ایک نالہ غلیظ پانی کا ہمیشہ

چارسو کا حوض جو فی الحال گلزار حوض کہلاتا ہے ازبسکہ خشک وخستہ وغلیظ رہتا تھا سوکھا حوض مشہور ہوا تھا۔ مولف نے بچشم خود دیکھا ہے اور اکثر سن لوگ دیکھے ہوئے موجود ہیں کہ حوض مذکور میں مٹی کے ظروف بیچنے کے لئے رکھتے تھے اور غلاظت پڑی رہتی تھی۔

چارمینارہ بھی خستہ حال تھا یعنی سیڑھیاں وغیرہ بھی ٹوٹی ہوئیں۔ اس کے اندر کا حوض بھی ہمیشہ خشک وغلیظ رہتا تھا۔ اور چارمینار کے اندر ٹٹیاں وغیرہ لگاکر دوکانیں لگائی جاتی تھیں۔ کچرا کوڑا پڑا ہوا۔ اجرت سے لکھنے والے کاغذ وقلم ودوات لئے ہوئے دن کو بیٹھے رہتے تھے۔ ایک طرف کوکسی فقیر نے اپنا مسکن بھی بنا لیا تھا۔ اور چارمینارہ عربوں کی بندوقوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ روزانہ گولیوں کی مار سے چھلنی ہوگیا تھا۔

نیز اوپر کے حصہ میں بعض جا پیپل وغیرہ کے درخت نکل آئے تھے۔

حضوری جلوخانہ کا چھوٹا دروازہ شمال رویہ تک اونچا چبوترہ تھا اس پر چار لوگ سرخ نری کے جوتے لاکر دو پہر سے شام تک بیچنے کو بیٹھتے تھے۔ ان کے سوائے لنگیاں۔ ازاربند وغیرہ بیچنے والے بھی بیٹھتے تھے۔

اس چبوترے کی پشت پر پردے پڑے ہوئے رہتے تھے۔ ان پردوں کے اندر ایک سیری آدمیوں کے چلنے کی۔ اس کے بعد کرسی وارنگلیات اس میں کناری گوٹا۔ مشروع۔ ہمرو۔ بیچنے والے بیٹھتے تھے وہ لاڑ بازار کہلاتا تھا۔

دور دور سے یہاں چلے آرہے ہیں اور پرورش ہو رہے ہیں یہ پرورشی کسی ریاست میں نہیں ہے۔ خداوندِ عالم بحق رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس سے زیادہ برکت اس ریاست کو عطا فرمائے سبحان اللہ کلام الملوک ملوک الکلام غفران منزل اکثر ارشاد فرماتے تھے کہ خداتعالیٰ دہلی کی ریاست کو ہمیشہ آباد رکھے۔ یہ سن کر ایک مرتبہ کسی مقربِ بارگاہ نے عرض کی کہ پیرومرشد پہلے اپنے ملک کے لئے دعا لازم ہے۔ جواب ارشاد ہوا کہ دراصل یہ دعا اسی ملک کے واسطے ہے کہ اگر خدانکردہ وہ ریاست تباہ ہوجائے اور وہاں کی مخلوق یہاں آئے تو لامحالہ اس ملک والوں کے لئے باعث تنگی روزگار کا ہوگا۔ غفران منزل کو جس امر کا اندیشہ تھا آخر وہی ہوا۔ علاوہ براں مدِ منصب میں تخفیف تدریجی لاحق ہوگئی ہے حالانکہ ایک ایک منصبدار متوسط کے گھر دس پانچ بندگانِ خدا اور بیوگان ویتیم پرورش ہوتے ہیں اور شب و روز ولی نعمت کے حق میں اور بقائے سلطنت کے لئے دست بدعا ہیں۔ پس حسب ارشاد مجیب الدعوات (اُدۡعُوۡنِیۡ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ) یہ تنخواہ بیکار نہیں بڑا کام کررہے ہیں۔ نیز یہ زمرۂ منصب منجملہ تزک سلطنت آصفجاہی اور موجب برکت وبقائے شاہی ہے چنانچہ اسی لحاظ سے مغفور اوّل سا دانائے روزگار و خیر خواہ سرکار نے جس طرح مداخل ریاست میں ترقی دی ہے اسی طرح پرورش بندگانِ خدا میں بھی توفیر کی۔

بہتا تھا چونکہ وہ مقام نشیب تھا اس لیے جب کبھی زور کی بارش ہوتی تھی چوطرف کا پانی جمع ہوکر چوک ایک تالاب ہوجاتا تھا اور ملکیات زیر مسجد وغیرہ غرقاب ہوجاتی تھیں۔

افضل گنج کا پل جس کا ذکر آیندہ ہوگا جب تیار ہوا تو ساتھ ہی دروازہ بھی جدید تعمیر ہوا۔ ورنہ قدیم دہلی دروازہ میں سے ندی پار جانے کا راستہ تھا۔ ندی کی اس جانب مہاراج گنج۔ بیگم بازار۔ کاروان۔ وغیرہ پرانے پل تک کہیں کہیں آبادی تھی۔ باقی تمام ویرانہ۔ اب جہاں افضل گنج و مسجد افضل گنج ہے وہ تمام کالی زمین ریگڑ کی پست و بلند تھی۔ رزیڈنسی چھاونی تک شاید کہیں کچھ مکانات دیول وغیرہ ہوں ورنہ تمام ویرانہ تھا۔ ادہر اسٹیشن اور مقام باغ عام حسین ساگر کا تالاب توپ کا سانچہ۔ رنبول کے احاطہ سے لے کر رزیڈنسی کی چھاونی تک تمام صحراو ویرانہ تھا۔ فی الحال جس بنگلے میں نظام کالج ہے اس مقام پر ایک مختصر قدیم بنگلہ تھا اس کو رنبول کی کوٹھی کہتے تھے۔ اب بفضلہ و باقبال خسروی و بریاضت مختار الملک مغفور اول یہ شہر اندرون و بیرون آراستہ و آباد امن و امان میں ہے۔ آبادی و تعمیر امکنہ روز افزوں کثرت مخلوق از حد بیرون بحمداللہ یہ ملک تمام اہل بلاد ہندوستان کا مرجع و امید گاہ بنا ہے خصوصاً ۱۲۹۱ھ سے یعنی جب سے کہ ریل حیدرآباد میں آگئی ہے اطراف و کناف سے مخلوق آئی اور آرہی ہے۔ لائق تو لائق ہیں ضعیف نو وسالہ اور معذور و ناکارہ بھی ہیں تو

کاش درصورت ضرورت تخفیف مغفور اوّل کی وہ تدبیر جو موازنہ مذکور میں تلافی ہے جس کا ذکر آئندہ آوے گا منظور و معمول سرکار عالی ہوتی کہ اس سے مقصود سرکار بھی حاصل ہوتا اور منصبدار بھی بحال رہتے۔ بحمد اللہ منصبداروں کی اب وہ حالت سابق بھی نہیں رہی ہے بلکہ مستعد کارگزاری و قیمتی خدمات ہیں۔

افسوس ہے بدقسمتی پر منصبداروں کی کہ مغفور اوّل کی تجویز و ہدایت پر جو عین بہی خواہی اہل منصب پر مبنی تھی مطلق عمل نہ کیا اور وقت کو ہاتھ سے دیا۔ اس کی کیفیت فصل آئندہ بیان ضلع بندی میں ناظرین ملاحظہ کریں گے۔

ترابعلیخان بہادر سرسالار جنگ شجاع الدولہ مختار الملک جی-سی-ایس-آئی

ف ۱۳۰۰ھ ۱۲۴۴ھ

بابِ دُوم

مجملاً بیان ریاضت و جانفشانی سالار جنگ مختار الملک مغفور اوّل انتظام ملک و رفاہ عام میں اور واقعات من ابتدائے مدار المہامی الیٰ آخرہ

واضح ہو کہ مختار الملک مغفور اول کے اجداد وغیرہ بزرگوں کا حال اجمالی مقدمہ کتاب میں ہر ایک کے نام کے ساتھ بیان کیا گیا ہے نیز کسی قدر خاندانی کیفیت مع کیفیت شادی وغیرہ نواب صاحب مغفور ضمیمہ سے منکشف ہو گی۔

اب خاص حسب و نسب کا ذکر اجمالاً یہ کہ نواب میر تراب علی خان بہادر سر سالار جنگ شجاع الدولہ مختار الملک فرزند نواب میر محمد علی خان بہادر سالار جنگ شجاع الدولہ و نبیرہ نواب نیر الملک بہادر ثانی د نبسۂ حقیقی میر عالم بہادر تھے۔ ان کے والد شجاع الدولہ کی شادی نواب شہاب جنگ افتخار الملک بہادر جو فی الحال معین المہام متفرقات سرکار عالی ہیں ان کے جد امجد نواب سید کاظم علی خاں بہادر

اس زمانے کے عربی۔ فارسی۔ ریاضی وسائنس کی تعلیم پائی۔ گھوڑے کی سواری اور ورزش بھی تھی کسی قدر ہوشیار ہونے کے بعد ذاتی طور سے تھوڑی سی انگریزی بھی پڑھی۔ اس زمانے میں باقاعدہ انگریزی علم کے معلم ملکی زبان جاننے والے اور کتابیں جیسی کہ اب ہیں کب میسر ہوتی تھیں۔ بہرحال۔ آیا من علم رادہ من عقل می باید۔ یہ مثل مختار الملک مغفور راؤں کے لیے صادق آتی تھی۔ جیسا کہ دیباچہ میں ذکر کیا گیا ہے

اس زمانے میں مولف کے والد جو کہ فارسی کے اہل زبان اور نہایت خوش لہجہ وخوش بیان تھے حسب الحکم سراج الملک بہادر اتالیقی و تعلیم زبان فارسی کے لئے مغفور اول ممدوح کی خدمت میں متعین رہ کر ہمیشہ حاضر رہتے تھے۔ اس لیے مولف نے والد مرحوم سے سنا ہے کہ نواب صاحب مغفور عہد صاحبزادگی میں اپنے چچا سراج الملک بہادر کے اکثر انتظامی امور کو ناپسند فرماتے تھے اور بجائے خود پیچ وتاب کھاتے تھے۔

عہد صاحبزادگی میں بھی ایسا اعتبار نواب صاحب مغفور کا ساہوکاروں کے نزدیک تھا کہ سراج الملک بہادر باوجود مدار المہامی لاکھ دو لاکھ روپے مصارف ریاست کے لیے قرض مانگتے تو ساہوکار ان کے برادر زادہ کی جو کم چاہتے تھے سراج الملک بہادر اپنے ہونہار برادر زادہ سے یعنی سالار جنگ بہادر سے جو کم کے خواہاں ہوتے تھے تو عرض کرتے تھے کہ فدوی جو کم کے لئے حاضر ہے مگر اس قرض کی ادائی کا انتظام کرنے کے لیے کوئی تعلقہ سپرد فدوی کیا جائے تو مناسب ہے چنانچہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ جب ہونہار برادر زادہ کی ذکاوت ولیاقت دیکھی تو بعض امور

مختار الدولہ کی دختر زینت النسا بیگم صاحبہ سے ہوئی۔ مختار الدولہ بہادر موصوف امرائے سلطنت سے تھے۔ بیگم صاحبہ ممدوحہ کے بطن سے ارسطوئے زمن مایۂ ناز و افتخار ہند و دکن نواب مختار الملک مغفور اوّل ۱۲۴۴ھ م ۲ر جنوری ۱۸۲۹ء میں متولد ہوئے۔

صغر سنی میں والد کا سایہ اٹھ گیا اور نواب نیر الملک بہادر ثانی جد امجد جو اس نبیرہ کو نہایت چاہتے تھے جن کے چاہنے کی کیفیت عجیب ضمیمہ سے ناظرین پر ظاہر ہو گی۔ وہ بھی مرحوم ہو گئے۔ خورد سالی میں جو سخت علیل ہوئے تھے تو اس کے سبب سے آغاز شباب تک لاغری و نقاہت لاحق رہی توانائی میسر نہ ہوئی۔ ایسی حالت میں تو کسی طفل کو تعلیم کا بار دینا مناسب نہیں جانتے ہیں چہ جائیکہ امیر زادہ اور تمام گھر کا ایک چراغ۔ اس کا جینا ہی غنیمت سمجھتے ہیں فلہذا زمانۂ تعلیم کے کئی سال یونہی گزر گئے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر سے کم کم تعلیم شروع ہوئی اور بتدریج پڑھائی ہونے لگی کہ ہرج نہ ہو۔

سراج الملک بہادر جو عمّو اور سرپرست تھے اکثر مبتلائے افکار رہتے تھے۔ بوجہ قرضۂ پدری و عتاب غفران منزل جملہ جاگیرات ضبط۔ صرف ایک دو گاؤں قلیل محاصل کے بپاس خاطر صاحبہ بیگم صاحبہ مغفورہ جو کہ دختر میر عالم مرحوم اور جدّہ ماجدہ مختار الملک مغفور کی تھیں چھوڑ دیئے گئے تھے اسی میں سب کی بسر ہوتی تھی۔ صاحبہ ممدوحہ کی ہی سرپرستی میں مختار الملک مغفور کی تعلیم و تربیت تھی حسب رواج

اس مقام پر مولّف کو تاریخ رشید الدین خانی کے مولّف کا یہ قول غیر صحیح یاد آیا جس کی اصل عبارت یہ ہے کہ بعد انتقال سراج الملک حضور پر نور تجویز میں تھے کہ اہل دفاتر و کارپردازان سرکار جھٹ والدہ سے سراج الملک بہادر کی سوال و جواب کر کے سالار جنگ بہادر بن شجیع الدولہ بن منیر الملک بہادر مرحوم کو تجویز کر کے معروضہ کئے اور مزاج کو خود بدولت کے کہہ سن کر سرفرازی پر اُن کی لے آئے الخ۔

اس بیان کے غیر صحیح ہونے پر وہ خط نواب صاحب مغفور کا جو بعد انتقال سراج الملک بنام مسٹر ڈابیٹن لکھا تھا دال ہے جس کی نقل مرقع عبرت میں مرقوم ہے۔ اس کا خلاصہ یہ کہ چند روز سے میرے چچا صاحب کو بخار وغیرہ کی شکایت چلی جاتی تھی لیکن بیسویں ماہ گزشتہ کو ان پر اس قدر مرض و ضعف کا غلبہ ہوا کہ نشست و برخواست سے بالکل معذور ہو گئے۔ باوجود شدت علالت کے جب ان کو قدرے افاقہ ہوا تو بروز شنبہ شریک دربار ہوئے اور حضور کی طرف سے گورنمنٹ انگریزی کے ساتھ معاہدۂ جدید کی تحریر و تکمیل کی۔ اس کے بعد ان کی حالت ابتر ہو گئی۔ مرض نے لحظہ لحظہ ترقی کرنی شروع کی۔

چوبیسویں تاریخ روز دوشنبہ حسب صلاح ڈاکٹر میکلین نقل مکان کیا گیا اور بسنن جی کے مکان واقع چادر گھاٹ پر اُن کو لے گئے۔ تو بھی ان کی حالت آناً فاناً ابتر ہوتی گئی۔ آخر کار چھبیسویں ۲۶ روز پنجشنبہ سات بجے شام کو انتقال فرمایا۔ تیسویں کو بروز دوشنبہ حضور پر نور نے دفعتاً مجھ کو یاد فرمایا اور ارشاد ہوا کہ

انتظام ملکی میں برادر زادہ سے مشورہ بھی لینے لگے تھے ۔

مسٹر ڈائیٹن جو سابق میں سرکار عالی کا انتظام کرتے تھے ان کے ساتھ نواب صاحب مغفور نے تعلقداری کرکے مال کے کام کا بخوبی تجربہ حاصل فرمایا تھا۔ نیز نظم جمعیت کے کام سے واقف ہو گئے تھے ۔

سنہ ۱۲۶۶ھ مطابق سنہ ۱۸۴۹ء میں اعلیحضرت نواب ناصر الدولہ بہادر نے سراج الملک بہادر کو جب دوبارہ عہدہ مدار المہامی سے سرفراز فرما کر جملہ معاش خاندانی واپس مرحمت فرمایا تو سراج الملک بہادر نے ان جاگیرات کو بغرض انتظام برادر زادہ موصوف کے اختیار میں دے دیا ۔

سیدی عنبر خانساماں سے مولف نے سنا ہے کہ یہ معاش یعنی جاگیرات واپس مرحمت ہونے کے لئے بسبب عدم زر نقد کئی لکھ روپیہ کی جواہر کی پیشکش غفران منزل ہوئی ہیں کیونکہ یہ جاگیرات قرضہ آبائی میں پھنس گئی تھیں اور حسب دستور عہد غفران منزل خزانہ شاہی سے تصفیہ قرضہ مذکور ہو کر جاگیرات داخل سرکار عالی ہو گئے تھے

المختصر جب سنہ ۱۲۶۹ھ میں بیمار ہو کر ماہ شعبان کی سترہ تاریخ کو روز پنجشنبہ سراج الملک بہادر نے انتقال فرمایا تو اس کے پانچویں روز یعنی بائیسویں کو ماہ مذکور کی روز دوشنبہ چوبیس برس کی عمر میں دفعتاً بلا درخواست مدار المہامی کی خدمت سے نواب سالار جنگ بہادر سرفراز ہوئے ۔

ان سے حزم و احتیاط اور کمال عزم و جزم نواب صاحب موصوف ہویدا ہے ۔ وزارت کی کشتی پر سوار ہونے کے وقت حالانکہ گرداب خسارت و تلاطم بدنظمی بحر ریاست صاف نظر آرہا تھا لیکن نواب صاحب مغفور کی عالی ہمتی و عزم جواں مردی نے کچھ اس کی پروا نہ کی اور نظر بخدا اوس کشتی پر گویا یہ کہہ کر سوار ہو گئے ؎

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفان شور افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسیہا

بفضلہ اس کشتی کو نہ صرف ساحل مراد تک پہنچا دیا بلکہ بحر سلطنت کو گرداب و تلاطم مذکور سے پاک و صاف کر دیا ۔

الحاصل مختار الملک مغفور خلعت دیوانی سے جب سرفراز ہوئے ہیں تو اہل دفتر و اراکین کو بنظر نحافت و کم سنی نواب صاحب مغفور یہ خیال تھا کہ یہ ابھی طفل نوجوان ہیں ان سے کیا ہوتا ہے ۔ خصوصاً بعد رحلت غفران منزل و جلوس مغفرت مکان آصفجاہ خامس اکثر دیرینہ اشخاص بے خبر "ریاست جملہ بازی گاہ طفلاں شد" ۔ کہنے لگے تھے کیونکہ رئیس و دیوان و پیشکار ہر سہ نوجوان تھے لیکن بعد ازاں معائنہ حسن انتظام و دانائی نواب صاحب مغفور تھوڑے ہی عرصہ میں کہہ اُٹھے ۔ خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم ۔ اسی اوائل زمانے میں جمشید جی معتمد مورد عنایات نواب صاحب مغفور کے تھے ۔ چونکہ نواب صاحب مغفور کے جوہر ذاتی کا ہنوز عام مخلوق کو یقین کامل نہ ہوا تھا تو ہر ایک کو یہ خیال تھا کہ بمشورت و رائے معتمد مذکور

دوسرے بیچ بھی حاضر رہیں اور صاحب رزیڈنٹ بہادر بھی اس وقت مدعو ہوں چنانچہ اکیسویں ھے کو دربار ہوا اور بغیر میرے یاد ادی صاحبہ کی درخواست کے حضور پرنور نے مجھے خلعت دیوانی اور راجہ نرندر بہادر کو خلعت پیشکاری مرحمت فرمایا۔

جی چاہتا تھا کہ عمّ مرحوم کی جاگیر پر قبضہ رہ کر گوشہ نشینی میں بسر کروں اور اپنی عمر ان خدشات اور افکار میں نہ گزاروں جو عہدۂ دیوانی کے ساتھ متعلق ہیں خصوصًا ان دنوں کہ حوادث گوناگوں سے ایک تلاطم پیدا ہے۔

لیکن ممکن نہ ہوا اور میرے یورپین اور ہندوستانی دوستوں کی یہ صلاح قابل تسلیم نظر آئی کہ اگر میں اس عہدے سے انکار کروں گا تو میں اور میرا خاندان تباہی میں پڑجائیگا۔

اگر خدا نے چاہا تو حتی المقدور کوشش کروں گا کہ اس سلطنت کو انواع انواع پیچیدگیوں اور طرح طرح کی الجھنوں سے نکالوں اور انتظام درست کروں۔

مسٹر بائی سن کے خط میں جو ایما جواہرات کے فروخت کا ہوا تھا میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس میں ابھی تھوڑے دنوں توقف کریں گے۔ آپ سچ سمجھئے کہ جہاں تک مجھ سے ممکن ہوگا میں روپیہ دے کر فک رہن میں کوشش کروں گا۔"

یہ اسی جوہر کا ذکر ہے جس کو نواب ناصر الدولہ بہادر غفران منزل نے برائے ادائی قرضہ رہن فرمایا تھا۔

نواب صاحب مغفور نے اس تحریر کے آخر میں جو خیالات اپنے ظاہر فرمائے ہیں

وہ یہاں رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ منجملہ اطفال مذکور فرامرز جنگ بہادر صوبہ دار اب تک موجود ہیں۔ مقام غور ہے کہ باوجود اس قدر عتاب کے معتوب کی اولاد کا لحاظ مدنظر رکھا بقول شیخ سعدی علیہ الرحمہ ؂

درشتی و نرمی بہم در بہ است چو رگزن کہ جراح و مرہم نہ است

اس زمانے میں باعث اخراج جمشید جی معتمد مذکور عتاب غفران منزل بھی مشہور ہوا تھا یعنی غفران منزل کو بھی یہی خیال ہوا تھا کہ معتمد مذکور دخیل امور وزارت ہے۔ بہرحال نواب صاحب مغفور نے ایسے معتمد کو دفعتاً بلا تامل جب خدمت سے بلکہ ریاست سے دور فرمایا تو اس وقت سب کی آنکھیں کھل گئیں اور یقین ہوگیا کہ یہ وزیر جوہر ذاتی رکھتا ہے کسی کی امداد کا محتاج نہیں۔

واضح ہو کہ اس وقت کے انتظام محاصل و کمی مداخل و افزونی مخارج سرکاری متعلق دیوانی کی کیفیت جو کچھ تھی باب اول میں مجملاً بیان ہو چکی ہے۔ علاوہ براں اسی زمانے میں تعلقات برار و رائچور دوآب ولدرگ محاصلی ترتالیس لاکھ ستتالیس ہزار نوسو تیس روپے اور تعلقہ بھوم والپور وغیرہ علاقہ دیوانی سے بابید ادائے قرضہ سرکار عظمت مدار میں اور سود و تنخواہ کنٹینجنٹ میں بطریق تعلقداری امانی سرکار عظمت مدار کے سپرد جو کئے گئے تھے اس سے بھی محاصل دیوانی میں کمی ہوگئی تھی۔

ہرچند ظاہرا دیوانی سرکار عالی دو بار عظیم سے سبکدوش ہوگئی تھی۔ ایک قرضہ بقایائے تنخواہ کنٹینجنٹ کے۔ دوم جمعیت کنٹینجنٹ کی ماہوار آئندہ دینے سے۔ مگر در اصل اس معاملے کے نتیجے میں

انتظام ریاست ہو رہا ہے۔ نیز معتمد صاحب کو بھی کچھ اس قسم کا ناز تھا چنانچہ جب
آتے تھے تو مانند دیگر معززین کے ڈیوڑھی پر میانہ سے اترتے نہ تھے بلکہ اندر زینہ ہائے
نور محل تک جو دیوان خانہ دربار عام ہے ان کا میانہ آتا تھا اس زمانے میں یہ
بڑی خصوصیت تھی۔ الحاصل بعد چندے نواب صاحب مغفور کو یہ تشویش لاحق
ہوئی کہ شب کو ہم تنہائی میں جو تجویزیں کرتے ہیں اس سے دوسرے ہی روز مخالفین
ہمارے واقف ہو جاتے ہیں یہ کیا ماجرا ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ جب اس کی فکر ہو گئی
تو بعض خیر خواہوں نے سراغ لگا کر جمشید جی کی نسبت خبر دی کہ در پردہ آپ کے
مخالفوں سے ملے ہوئے ہیں۔ نواب صاحب مغفور ایسے نہ تھے کہ بمجرد استماع خبر
یقین کر لیتے اور درپے انتقام ہو جاتے لہذا یقین کامل حاصل کرنے کے لئے
یہ کیا کہ ایک شب جبر رکھ کر بہ تبدیل لباس بذات خود گھوڑے پر سوار ہو کر مع سیدی عنبر
خانساماں حد رزیڈنسی تک گئے وہاں سے گھوڑوں کو چھوڑ دیا اور پیادہ پا
جمشید جی کے بنگلے پر پہنچے تو دیکھا کہ بنگلے کے پھاٹک میں ایک میانہ رکھا ہوا ہے۔
جب پوچھا گیا تو کہاروں نے ایک مخالف نواب صاحب کا نام لیا کہ یہاں آئے
ہوئے ہیں اور یہ میانہ ان کا ہے۔ جب اس طرح تحقیق فرما کر واپس ہوئے تو
اسی وقت شب کو بنام رزیڈنٹ بہادر رقعہ لکھا کہ صبح ہوتے ہی جمشید جی کا اخراج ہو۔
اس حکم نواب صاحب کی تعمیل جب صبح کو ہوئی اور جمشید جی مع عیال و اطفال چلے
تو نواب صاحب مغفور نے کہلا بھیجا کہ اطفال بے گناہ کو ہمراہ لے جانے کی کیا ضرورت ہے

ان تمام امور متذکرہ کا تصفیہ و انتظام آسان نہ تھا۔ اور اخراجاتِ معمولی کے لئے افزائش محاصل کا بندوبست اہم ترین انتظام دیوانی تھا۔ حالانکہ صرف یہی ضروریات و مشکلات نہ تھے بلکہ درستی و خوبی انتظام سرکاری کے لحاظ سے ہر تعلقہ و ہر ضلع میں دیوانی و فوجداری عدالتیں قایم کرنے کے لئے اور ان عدالتوں کی نگرانی کا اہتمام و انتظام مصدر میں کرنے اور برائے بہتری انتظام مالی عہدہ داران متغیر و بنش قرار مواجبی متقرر کرکے تعلقات دیوانی امانی میں رکھنے کے واسطے اور دوسرے علحدہ سررشتے اہتمام محاصل غیر اراضی کے لئے اور اجرائے پیمائش اراضی و تشخیص و تقرر دہارا کے لئے اور انتظام تعلقداری ضلع واری کے لئے جس سے ڈکیتی اور خونریزی و رہزنی وغیرہ کا انسداد ہو۔ اور تعلقات و اضلاع میں جمعیت کوتوالی ایجاد کرنے کے لئے ٹوٹے ہوئے تالابوں کو ترمیم کرنے اور آبپاشی کے واسطے نالے بنانے کے لئے۔ بلدہ کی اور دیہات کی سڑکیں درست کرنے کے لئے اور تعلقات میں انتظام تعلیم کے لئے۔ اور سرکاری شفاخانے اضلاع میں جاری کرنے کے لئے۔ مصارف صفائی بلدہ و دیہات کے لئے۔ اہتمام ٹپہ اور اجرائی ریل۔ نیز اتفاقی و ناگہانی اخراجات از قسم قحط وغیرہ کے لئے خزانہ کافی و وافی چاہیئے تھا۔ مگر مقام غور ہے کہ اس قدر مشکلات کا سامنا اور حل ہونا ان تمام مشکلات کا منحصر رزخطیرہ خزانہ کثیر پر تھا۔ اور حالت مملکت یہ کہ خزانہ دیوانی خالی قرض کمیاب۔ تعلقات جو عاملان سابق کے تفویض کئے گئے تھے ان کی رقم محاصل صرف تخمیناً بہتر لاکھ چوراسی ہزار ایک سو تہتر روپے باقی رہ گئے تھے۔

کئی دعوے قرضے کے اور زیر بار بان حد سے زیادہ تھیں۔ یعنی جو جاگیردار ملک
وغیرہ سے خارج ہو گئے تھے۔ جیسے کہ جاگیرداران الیچپور و جاگیردار مجوم راجہ راؤ
اور سلطان نواز جنگ۔ دلاور جنگ۔ بدھن خاں عبداللہ بن علی عمر بن عوض وغیرہ و سے
اپنی جاگیرات کا معاوضہ طلب کر رہے تھے۔ ان میں ہر ایک کا دعویٰ رقم خطیر
ساتھ یعنی پانچ لاکھ سے تئیس لاکھ روپے تک تھا۔ اقربایان خاص کی او
منصبداروں کی ماہوارین جو ایک رقم کثیر ہوتی ہے بغیر جائداد کے تھیں۔
سکھوں کی جمعیت جیسا کہ اپر ذکر کیا گیا ہے بقایائے تنخواہ کے لئے دولتخ
حضور پرنور پر دنگا بیٹھی تھی۔ نیز دوسرے مطالبے والے مانند سلطان غالب
و بالاسود و قلندر بیگ وغیرہ و اہل رسالۂ خاص بھی دنگا کر رہے تھے۔ چنانچ
دولت خانے پر سے نکالدینے کے لیے حکم ہوا تو قلندر بیگ لڑبھڑ کر مارا گیا۔
جواہرات مرہونہ رقمی ساٹھ لاکھ روپے جس کو ڈسٹین صاحب لندن لے
تھے اس کو رہن سے چھڑانے۔ اور بڑا الماس جو ساہوکاروں کے پاس رہن تھ
اس کو فک رہن کرنے کے لئے پیشگاہ حضور پر نور سے تقاضا ہو رہا تھا۔ اس کے
سوائے تعلقات برار جن لوگوں کے رہن میں تھے ان سے بغیر ہنگامہ و فساد کے
گزاشتیں لے کر صاحب عالیشان کو دینا ضروری تھا۔ اور کئی رقمیں از رقم برآمد
تنخواہ وغیرہ دینے کی تھیں۔ ساہوکاروں کے قرضے کی بھی رقم کثیر تھی یعنی دو
ستر لاکھ روپیہ تخمیناً ہوا تھا۔ واگزاشت تعلقات جمعداران عرب وغیرہ

ناجائز جن کی تفصیل بیانِ حالات زمانہ سابق میں بتلائی گئی ہے وہ تمام موقوف کردیئے
گئے سوائے دوسرے بعض ابواب مال و محصولات جن کی تفصیل معتد بہ تھی اور تمام ممالک محروسہ
میں مانند مالگزاری کے وصول ہوتے تھے اور رعایا کو ناگوار بھی نہ تھی۔ وہ بھی معاف
کردیے گئے۔ بایں لحاظ کہ مالگزاری اراضی کے صیغہ سے خواہ بنام زراعت یا ابواب
یا ثلبیات قرار دے کر رعیت کاشتکار سے جو روپیہ لیا جاتا ہے وہ سب ایک ہی رعیت سے
یا اسی ایک قطعہ زمین کی پیداوار سے لیا جاتا ہے۔ پس رعایا پروری سے بعید ہے
کہ مختلف ناموں سے اور بعد اجداد بقیۃ الرعیت سے روپیہ لینے کا طریقہ جاری رکھا
جائے خصوصاً ایسی حالت میں کہ زیادہ ستانی و بدقولی زمانہ سابق سے رعایا شکستہ خاطر
و نادار ہو گئی ہو اور طاقت ادائے مال واجب کی جو عین المال ہے نہ رکھتی ہو
علیٰ ہذا القیاس سائر و بدیہی اور درآمد غلہ او محترفہ کے محصولات جو مانع تجارت
و حرفت تھے معاف کر دیے گئے۔ زہے انصاف و ترحم نواب صاحب مغفور۔ ابواب
و محصولات جو کہ معاف کر دیے گئے ان کی سالانہ رقم کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

بابت	رقم سرسکن سالانہ
ثلبیات خفیف و منعرف	[illegible]
امرائی	[illegible]
بنجرائی	دو آنہ [illegible]
شہر سدہ ہارنی	[illegible]

سو وہ معمولی اخراجات کے لئے بھی ناکافی تھے ۔ چہ جائیکہ اس سے حلّ مشکلات موجودہ میں کامیابی کی امید اور مصارف آئندہ کو کافی ہونے کی توقع رکھی جاتی ۔

چونکہ بغیر سرمایہ کافی و خزانہ کثیر ملک و ریاست کا کوئی انتظام خوبی کے ساتھ انجام نہیں پاسکتا ہے لہذا نواب مختار الملک بہادر کو لازم ہوا کہ اس عمل جدید میں زمینات خالصہ کی افزایش اور محاصل سرکاری کی ترقی اور تخفیف اخراجات غیر ضروری کی اور تجویز ان مصارف کی جو مناسب موقع پر تہذیب و بہتری ملک میں ہوا کی جائے ۔ چنانچہ اصل تدبیر و عین کوشش افزایش محاصل و آسائش رعایا کے لئے یہ کی گئی کہ دیوانی کے تعلقات جو سابق کے عاملوں کو بطور تعلقداری امانی اور تنخواہ داروں کو بطور تنخواہ و جاگیر کے سپرد کئے تھے ۔ یا ٹھیکہ داروں کو تعہد دئے گئے تھے وہ سب رفتہ رفتہ واگذاشت کرلے کر دیوانی کے اہتمام و انتظام میں لیئے گئے اور تشخیص و تحصیل رقم خام میں امانی کئے گئے ۔ اسی طرح جاگیریں اور انعامات اراضی جو معتبر سند نہیں رکھتے تھے یا عطا حاکم مقتدر کی نہ تھی وہ خالصے میں لے لئے گئے ۔ اور انتظام مالگزاری و آبکاری میں جدید و مفید تجویزیں عمل میں لائی گئیں ۔ یعنی ٹھیکہ داروں کی موقوفی اور ناجائز بٹیاں جو ٹھیکہ داروں کے ایجاد کئے ہوئے تھے اور موجب اذیت رعایا تھے جس کی آمدنی سالانہ قریب تیس لاکھ روپے تھی موقوف و معاف کر دی گئیں ۔ نیز بٹائی اور گذم کے طریقے کی مسدودی اور دہارے کی رقم نقد کا تعین اور کمال اہتمام پابندی قول میں ۔ نیز رواج دینا پیمائش پختہ کا اور تشخیص دہارے کی بمعاد سی سالہ ۔ اور بٹیات

ایسے آقا کو راضی رکھنا یہ لیاقت خدا نے مغفور ہی کو دی تھی۔ بعد **غفران منزل** عہد **مغفرت مکان** میں وہ مجبوری نہ تھی تو بھی مصاحبین **مغفرت مکان** کی اشتعالک دفتنہ پردازیوں کی وجہ سے نواب صاحب مغفور دل کھول کر انتظام کر نہیں سکتے تھے۔ ایک نہ ایک امر میں معاندین **مغفرت مکان** کو برافروختہ کر دیتے تھے۔ ایسے زمانے میں جان پر کھیل کر جو کچھ انتظام کیا وہ **مغفور** ہی کا کام تھا۔ اور جو دقتیں اور کاہشات لاحق ہوئے ہیں جس کا ذکر عہد **مغفرت مکان** میں کیا جائے گا۔ اس کو مغفور ہی جانتے تھے یا اس زمانے کے وہ لوگ جو اہل فہم و باخبر تھے

بعد **مغفرت مکان** ۱۲۸۵ھ سے البتہ نواب صاحب مغفور کو خاطر خواہ انتظام کرنے کا موقع میسر ہوا اور **مختار الملک** اسم با مسمیٰ ہوئے۔

بوجوہات متذکرۂ بالا انتظام کوتوالی و عدالت و امنیت بلدہ و بیرون بلدہ جیسی کہ چاہیے مغفور اوّل دیوان ہونے کے بعد بھی کئی سال تک نہ تھی اگرچہ کوتوالی و عدالت کا انتظام بتدریج ہو رہا تھا لیکن علاوہ وجود متذکرہ کے مغفور کو ابتداءً مالی و ملکی امور سترک کی اصلاح میں زیادہ تر مصروفیت رہی کہ پہلے اس کی اصلاح لازم تھی۔ نیز در اصل جملہ امور ریاست کی اصلاح ایک انسان سے وقت واحد میں ممکن بھی نہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ مخلوق یہاں کے قانون سے ناواقف محض۔ اعلاؤں کے دماغ میں خود حاکمی سمائی ہوئی۔ عام رعایا بند متمرد و شوریدہ سر و شورش کے عادی۔ جس کا ذکر باب اوّل میں کیا گیا ہے۔ نگاہوں میں نہ کوتوالی کی کوئی

رقم سر شکن سالانہ	بابت
[illegible] لک [illegible]	سائر و بدیہی
[illegible] لک	محصول درآمد غلہ
[illegible] لک [illegible]	محترفہ
[illegible] لک	تخفیف در محصول پنبہ سرنج و نیل وغیرہ

تا آنکہ رعایا عام طور پر اطمینان و امن و آرام کے ساتھ زراعت و تجارت کی ترقی میں مشغول ہوئی۔ اور ادھر محاصل میں روزانہ ترقی ہونے لگی۔ اور سرکار قرضداری و زیرباری سابقہ سے سبکدوش ہوئی۔ آمدنی و خرچ افراط و تفریط سے اعتدال کے درجہ پر آیا۔ بلکہ آمدنی افزونی دکھانے لگی۔ اسی اثنا میں خوبی اقبال سرکار عالی اور حسن عمل و زیر باتدبیر سے کئی تعلقات بھی ملک آبائی سے واپس آگئے الخ

ایک خزانہ عامرہ قایم کیا گیا۔ دفتر صدر محاسبی۔ دفتر مہتمم خزانہ۔ دفتر مہتمم تعمیم منصبداران قرار پایا۔ بفضلہ سرکاری اعتبار بہت کچھ بڑھ گیا۔ سلطنت رونق پکڑی۔ نواب صاحب مغفور کو خصوصاً آغاز دیوانی کے تخمیناً تین سال تک سب سے زیادہ دقت و مجبوری تھی کیونکہ غفران منزل انگریزی قانون وغیرہ کے نام سے نہایت برہم ہوتے تھے۔ پس اس لحاظ کے ساتھ انتظام ملک کرنے میں مغفور کو سخت مشکل کا سامنا تھا۔ اور سرکار انگریزی سے اتحاد بڑھانا اور اپنے

باوجود مختار الملک مغفور سالار المہام جناب سرگرم انتظام ملک رہنے کے اہل ملک
اپنی اس رفتار قدیم پر قائم تھے۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس زمانے میں
خود سری و آزادی کیسی تھی۔ اور یہ بھی غور کے لائق ہے کہ نواب صاحب مغفور
کی طبع مہذب و منتظم کے کسی قدر خلاف یہ طریقہ ہوگا۔ مگر کیا کر سکتے تھے۔ اس لیے
سردست اہل ملک کی اس رفتار ناموذب سے چشم پوشی مناسب جان کر انتظام
ملک و رفاہ خاص و عام میں مصروف رہے تا آنکہ اس امر خاص و مہم عظیم میں بفضلہ
کامیاب ہوئے۔ اور خاص و عام کلہم مخلوق کے دلوں پر مغفور کی وقعت و عظمت
چھا گئی۔ اس وقت مغفور کے ادب تہذیب نے اثر بخشا اور وہ طریقے متروک ہو گئے۔
مانند طبیب حاذق کہ جب کسی مریض کا سبب مرض محض ناتوانی پاتا ہے تو اس مرض
کا علاج نہیں کرتا بلکہ رفع ناتوانی کی فکر کرتا ہے اور طبیعت کو تقویت دیتا ہے تا آنکہ
وہ مرض خود بخود زائل ہو جاتا ہے۔

الحاصل ایسے زمانے میں نواب صاحب مغفور ہی کا کام تھا جو بتدریج و تامل
کوتوالی اور عدالتوں کو ترقی دے کر جن کا ذکر موازنہ مذکور میں آیندہ آئے گا۔
سب کی نظروں میں با وقعت کیا جس کی باعث ظلم کم اور انصاف زیادہ ہونے لگا۔
ابتداءً مجلس مرافعہ کی یہ صورت تھی کہ چاندنی کا سفید فرش اس پر تین رکن
چھوٹے چھوٹے میز روبرو رکھ کر کرسیوں پر بیٹھنے لگے۔ تھوڑے زمانے کے بعد
کٹگر دار اور نیچے چبوترے پر کرسیاں رکھی گئیں۔ اس پر حکام عدالت کا اجلاس

وقعت نہ عدالت کی کچھ حقیقت۔ عدالت موجودہ کا فیصلہ بعمل میں لیا ہوا مستغیث برسوں سرگرداں رہتا تھا تعمیل نصیب نہیں ہوتی تھی۔ تعمیل کیونکر ہوتی کہ ایک معمولی شخص کے بھی گھر پر بغرض تعمیل جاتے تھے تو وہ براہ تمرد تعمیل کنندہ کو واپس کردیتا تھا چہ جائیکہ معززین و امرا وغیرہ۔ ان کی ڈیوڑھی پر تو تعمیل کا خیال بھی نہیں جاسکتا تھا۔

نواب صاحب مغفور ایسے زمانے میں مدارالمہام ہوئے تھے کہ عموماً امرا و اہل مقدرت عیش دوست تھے۔ اکثر ناچ رنگ میں مشغول رہتے تھے۔ کسبیوں سے تعلق رکھنا عیب نہ تھا۔ اور ان کے ساتھ جس قدر ہوسکے سلوک کرنا باعث نام آوری و لازمۂ امارت جانتے تھے اگرچہ کتنا ہی قرضہ لاحق ہوجائے۔ گویا اس زمانے کا وہ فیشن تھا۔ چنانچہ مغفور اوّل مدارالمہام ہونے کے بعد بھی چند سال تک حسب عادت قدیم جمعداران ذی حشم وغیرہ بتاریخ ہفدہم ماہ رجب اپنی اپنی کسبی کو بازیور گراں بہا و لباس پرتکلف ہاتھی پر سوار کرکے اپنی جملہ جمعیت پیدل و سوار۔ ڈنکا۔ نشان عرب مرفعہ بجاتے اور ضامن بولتے ہوئے اس کی جلو میں دے کر روز روشن لنگم پلی کے میلے میں روانہ کرتے تھے۔ اور خود بھی کسی بالاخانہ پر بیٹھ کر بہ کمال افتخار اس کی سواری دیکھتے تھے۔ اور اپنی معشوقہ تمام میلے میں حسن فروشی کے لئے جو پھرتی تھی دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ نشان و علامات جمعیت سے میلے کے لوگ پہچان لیتے تھے کہ فلاں جنگ یا جمعدار کی یہ کسبی ہے۔

تعمیل فیصلہ جات کے لئے ایک محکمہ موسوم بہ محکمہ اجرائے اعمال قایم فرمایا۔ اس کا صدر بہادر موصوف کو قرار دے کر سمجھایا کہ ہنوز یہاں کے لوگ قانون سے ناآشنا و جاہل ہیں لہذا موقع و محل دیکھ کر کام کریں۔ مانند سرکار انگریزی کے کارروائی نہ ہو۔

بہادر موصوف کام کرنے لگے تا آنکہ ایک شخص پر حسب فیصلہ عدالت تعمیل جاری کی اور اس کا مال و سامان قرق کیا گیا۔ وہ شخص علاقہ دار محلات مغفرت مکان تھا۔ اس نے جا کر شکایت جو کی تو بنام نواب صاحب مغفور عتاب نامہ آیا کہ اب ہمارے علاقہ داروں کے ساتھ یہ برتاؤ ہونے لگا ہے۔

معتمد الدولہ بہادر نے یہ دیکھ کر عرض کیا کہ جب یہاں کی ایسی نازک معاملت ہے تو مجھ کو معاف رکھیں۔ یعنی استعفا دے دیا۔

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو عدالتوں کی وقعت قایم کرنے اور بہت رعایا اور رعا دادرسی رعایا ہونے کے لئے جو فرض سلطنت ہے نواب صاحب مغفور نے واقعی بڑی بڑی زحمتیں اٹھائی ہیں۔ حتیٰ یہ کہ اسی زمانے میں محل خاص نواب صاحب مغفور نے ایک اصیل کو بالزام سرقہ اپنے ملازمین سے مار کھلوایا تھا۔ اس اصیل کے دعوے کی بنا پر عدالت سے حسب قانون بنام محل موصوف طلب نامہ جاری ہوا تو جواب دہی کے واسطے اپنے محل کی جانب سے بذات خود نواب صاحب مغفور عدالت میں تشریف لے گئے تھے تاکہ ادائے شہادت وغیرہ کے واسطے عدالت میں

حاکمانہ قرار پایا۔ تاآنکہ اہل مقدمات کی نظروں میں فی الجملہ عدالت کی وقعت قایم ہوئی۔

المختصر ہر ایک امر کے انتظام کو نہایت تدبیر و تامل کے ساتھ جیسا کہ اُس زمانے میں چاہئے تھا نواب صاحب مغفور نے پورا کیا۔ عام رعایا تو جوں توں عدالت میں رجوع ہونے اور احکام عدالت کو ماننے لگی لیکن حضرات عرب سوائے اپنی قومی پنچایت کے کب کسی کو مانتے تھے۔ حکام ہندی کے روبرو مستغیث ہونے کو عیب جانتے تھے۔ لہذا نواب صاحب مغفور نے عربوں کے جمعداروں سے فرمایا۔ بہتر ہے پنچایت ہی سہی لیکن پنچوں میں سرکاری پنچ بھی شریک رہنا لازمی ہے اس لئے میں خود شریک ہوتا ہوں۔ جمعداروں نے بہ کمال خوشی قبول کیا بلکہ الوالپنچ اپنا یعنی میر مجلس نواب صاحب کو قرار دیا۔ بعدازاں نواب صاحب مغفور نے ضرورت تبلا کر حسب پسند جمعداران مذکور ایک عالم فقہ دان یعنی مولوی عبدالقادر صاحب کو منقرر فرمایا اور اس محکمہ کا نام قضایائے عرب رکھا۔ اُس میں خاص عربوں کے مقدمات دریافت ہونے لگے۔ فیصلوں کی تعمیل بھی عربوں ہی کے ذریعہ سے ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ راہ پر آگئے اور سرکاری عدالتوں میں بھی رجوع ہونے کو گوارا کر لیا۔ محکمۂ مذکور میں ابتدائً مولوی محمود اور ان کے بھائی نے بھی کام کیا ہے۔

فی الجملہ عدالتوں کا انتظام ہو اتھا مگر فیصلوں کی تعمیل عام طور پر نہیں ہونے پاتی تھی۔ اس لئے نواب صاحب مغفور نے میرزا علی محمد خان معتمد الدولہ بہادر ساکن بمبئی کو جو انگریزی سرکار میں کام کیے ہوئے تھے یہاں طلب فرمایا اور خاص

نواب صاحب مغفور نے یہ تجویز کی یعنی ایک مُہر سرکاری محکمہ قضات کے لئے تیار کرائی اور مہتمم تعمیل کے سپرد کر کے فرمایا کہ اس مہر کو فیصلوں پر ثبت کر کے جاری کرتے جائیں۔ چنانچہ اسی طرح حکم کی تعمیل شروع ہوگئی اور اہل مقدمات بیچارے خوش ہو گئے۔

اسی زمانے کا ایک واقعہ زبانی نذر علی خاں موصوف یہ بھی ہے کہ بنام اعظم علی خاں فرخ نگری کئی ہزار روپے کا عدالت دیوانی بزرگ سے فیصلہ صادر ہوا تھا مگر بوجہ سرکشی خان مذکور تعمیل ہونی نہ تھی۔ ایک روز خان مذکور سوار اسپ کا گزر راستے سے ہو رہا تھا اور خان مذکور غالبًا نہتے تھے یعنی بے ہتیار کے تھے۔ حکیم مولوی محمد سعید خاں ناظم عدالت موصوف کو یہ خبر جو ملی تو سپاہیوں کو حکم دے کر خان مذکور کو عدالت کی حراست میں لے لیا۔

نواب صاحب مغفور نے یہ کیفیت سن کر ناظم صاحب موصوف کو کہلا بھیجا کہ رقم تعمیل کے ہم ذمہ دار ہیں اعظم علی خاں کو چھوڑ دو۔

ناظم صاحب مذکور کو جو اہل بھوپال تھے ضرورت سے زیادہ ضابطہ کی سوجھی اور نواب صاحب مغفور کے جواب میں یہ کہا کہ جب تک رقم تعمیل عدالت میں نہ آئے گی خان مذکور کو نہ چھوڑوں گا۔

حالانکہ نواب صاحب مغفور کو اپنے حکم کی تعمیل کا نہایت لحاظ تھا مگر افزائش وقعت عدالت بھی از بسکہ منظور تھی۔ اس جواب صاف کو ناظم عدالت کے

جانے کو جواہل حیدرآباد عیب سمجھتے ہیں وہ عیب اٹھ جائے اور عدالت کی وقعت وعظمت بھی بڑھے۔

اس عدالت کے حاکم اس وقت مولوی محمد امین الدین خاں تھے۔ اور سننے میں آیا تھا کہ انھیں تاکید کی گئی تھی کہ میرے لئے کوئی تعظیم و تکریم عمل میں نہ آئے بلکہ عام اہل مقدمات کے ساتھ جو برتاؤ ہوتا ہے ویسا ہی میرے لئے ہو۔

اس صورت میں قیاس یہ کہتا ہے کہ طلبنامہ بنام محل خاص موصوف جاری جو ہوا تھا وہ بھی بایماد اجازت نواب صاحب مغفور ہوا تھا۔ ورنہ ویسے زمانے کی عدالت میں یہ قدرت و جرات کہاں تھی۔

نذر علی خاں نامی جو اہل بھوپال او مسن شخص ہیں جنھیں نواب صاحب مغفور نے محکمۂ قضاءت میں منتظم تعمیل کیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ اس وقت قاضی صاحب کی دو مہریں تھیں۔ ایک بڑی اور ایک چھوٹی۔ فیصلہ پر بڑی مہر کرانے کو دس روپے مہرانہ لیتے تھے اور چھوٹی مہر کے پانچ روپے۔ جب تک اہل مقدمہ مہرانہ مذکور داخل نہیں کرتا اس کے فیصلہ پر مہر ثبت نہ کرتے تھے جس کی وجہ سے پانسو فیصلے ملتوی پڑے ہوئے تھے نواب صاحب موصوف نے کیفیت سماعت فرماکر اس عمل ناجائز کو موقوف کرنے کے لئے ہدایت کی مگر چونکہ اس زمانے میں رئیس و رعایا کی نظروں میں شریعت پناہ قاضی صاحب ایک وقعت خاص رکھتے تھے اس لیے نواب صاحب مغفور کی ہدایت پر توجہ نہ کی اور اپنے اس عمل نامرضیہ کو بدستور قائم رکھ کر جاری رکھنا چاہا۔ آخر کار

ہیں فی روپیہ تین آنے تحریر دیوانی قرار پائی تھی جس کا تخمینہ بائیس۲۲ لاکھ روپیہ سالانہ
تھا۔ عمل نیر الملک بہادر ثالث میں تحریر دیوانی پچاس ہزار روپیہ ماہانہ جس کے
سالانہ چھ لاکھ روپے ہوتے ہیں مقرر تھی۔ تحریر پیشکاری مہاراجہ چندو لعل بہادر
فی روپیہ آدھے آنے کے حساب سے جس کا تخمینہ دو لاکھ پچاس ہزار روپے سالانہ
تھا۔ اس کے سوائے دوسرے ابواب مانند دہ یک وغیرہ تھے۔ نیز دوسرے
جملہ اخراجات مہاراجہ کے سرکاری اخراجات میں ملے ہوئے تھے۔ سراج الملک بہادر
پچیس ہزار روپے ماہانہ یعنی تین لاکھ روپے سالانہ تحریر دیوانی پاتے تھے۔
مگر آفریں ہے مختار الملک مغفور اوّل کی عالی ہمتی و خیر خواہی پر کہ بنظر
زیر باری ریاست اپنی تحریر دیوانی پچیس ہزار ماہانہ میں سے دس ہزار روپے
تخفیف کر لئے اور پندرہ ہزار تحریر پیشکاری میں سے پانچ ہزار تخفیف کر کے دس ہزار
روپے ماہانہ قرار دیے۔ گویا ایک اپنی تحریر میں دیوانی و پیشکاری ہر دو کام اجرا کئے
اور سرکار عالی کی کفایت مدنظر رکھی اور مدت العمر وہی پندرہ ہزار ماہانہ لیتے رہے۔
حالانکہ بکمال جانفشانی و حسن انتظام خسارہ ریاست کو دور اور بافزائش محاصل ملک
خزانہ شاہی کو معمور بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ از روئے موازنہ مذکور بابت ۱۲۸۰ف
رقم محاصل بابتہ ۱۲۶۲ف جملہ [illegible] چوہتر لاکھ ایکاسی ہزار آٹھ سو ترانوے
روپے چلتی تھی۔ بعد ازاں اس کو مغفور کے حسن انتظام نے پنجگونہ کر دیا۔
ملاحظہ ہو موازنہ بابتہ ۱۲۹۱ف جس سے ظاہر ہے کہ جمع بابت ۱۲۸۹ف

سماعت فرماکر بکمال ضبط و تحمل فی الفور رقم تعمیل عدالت میں بھیجدی خان مذکور کو عدالت سے رہا کرادیا۔ لیکن بعدازاں ناظم صاحب مذکور کو بجرم عدول حکمی نظامت سے معزول کردیا۔

چونکہ لائق عہدہ داروں کی اس وقت ضرورت بھی تھی لہذا دو سال کے بعد مولوی محمد سعید خاں صاحب موصوف کو پھر دوسری خدمت دی یعنی محکمۂ دریافت انعامات کا ناظم کیا۔

علیٰ ہذا القیاس انتظام کوتوالی بھی اسی طرح بتدریج ہوتا گیا ہے جس کا مجملاً حال موازنہ مذکور کے فقرہ (۱۴) سے آیندہ ظاہر ہوگا۔ مگر عہد مغفور میں کوتوال اندرون علحدہ تھا اور کوتوال بیرون بلدہ علحدہ۔ عہد دیوانی عماد السلطنۃ مرحوم سے اندرون و بیرون بلدہ کی کوتوالی حسب استدعا اکبر جنگ اکبر الملک کوتوال مرحوم ایک ہی ہوگئی ہے۔ اور جمعیت میں افزایش بھی ہوئی۔

موازنہ مذکور بابت ۱۲۸۰ھ ف سے ظاہر ہے کہ ہر ایک امر کے انتظام میں نواب صاحب مغفور کی نظر مداخل پر رہتی تھی کہ ریاست زیر بار نہ ہو۔ چنانچہ صیغۂ مال و عدالت میں افزایش عہدہ داران لائق کی ضرورت بتلاکر فرمایا ہے کہ اجرائی اس تجویز کی منحصر ہے تخفیف اخراجات غیر ضروری و زیادتی خزانہ پر۔

واضح ہو کہ زمانۂ سابق میں تحریر دیوانی بہت بیش قرار تھی چنانچہ اعظم الامرا ارسطو جاہ کے عمل میں بحساب فی روپیہ دو آنہ تحریر دیوانی تھی۔ اور عمل میر عالم بہادر

اب جو ہو سو ہو میں تو جاکر اپنے علاقہ کی ماہواریں لے لیتا ہوں اور آیندہ بفضلہ ماہ بماہ تنخواہیں ملنے سے تکلیفیں دور ہو جائیں گی ۔ حاکم سے مخالفت کرکے کیا فائدہ چنانچہ ہمارے ہم قوم بہت سے جو تن بخشیں مہینے گنتے گنتے مرگئے ۔ یہ کہہ کر جمعدار مذکور گیا اور رقم بقایا پر وصول کی مہر ثبت کردی اور حسب قرارداد سرکار عالی اپنے علاقہ کی رقم ماہوارات اٹھالائی اور اظہار خوش حالی کرنے لگا ۔ یہ کہہ کر دیگر جملہ جمعداران وسلحداران عہدوی چاروناچار تعمیل حکم سرکار پر راضی ہوگئے اور اسی طرح رقم بقایا پر مہر وصول ثبت کرکے حسب قرارداد سرکار ماہواریں اپنی اٹھالائے ۔ بفضلہ منصبداران و انیبازیان و جمعیت منفرقات وغیرہ جملہ ملازمین کی تنخواہ ماہ بماہ تقسیم ہونے لگی ۔

یا فقط نام تنخواہ کا سنتے تھے اس کی صورت سے واقف نہ تھے ۔ اب جو ماہ بماہ تنخواہ ملنے لگی تو ایک عام خوش حالی پدید تھی ۔ ہر گھر میں گویا عید تھی ۔ بنئے بقالوں کے ہاتھوں سے نجات ملی افلاس دُور ہوگیا ۔ دوست دشمن سب یک زبان ۔ نواب سالار جنگ بہادر کے مدح خوان ۔ جا بجا چرچے کہ سراج الملک کا بھتیجا کیا لائق نکلا ہے ماشاء اللہ ۔ اس کمسنی میں یہ عقل و تدبر سبحان اللہ ۔ ایسا دیوان تو آج تک کوئی نہیں ہوا یہ خداداد ہے ۔ اس کی نسبت **نواب ناصر الدولہ بہادر** کا صحیح ارشاد ہے کہ گھوڑے پر سے ہمیں ہیرا ملا ہے کیا پوچھنا کلام الملک ملک الکلام لیکن ہیرے کو پہچاننا بھی جوہر شناس ہی کا کام ہے ۔ زہے بصیرت و فراست

الہ اللعہ لک سے کرور تین کرور اکتالیس لاکھ اکاون ہزار ہوئی۔ برایں ہم اپنی تحریر دیوانی کا تکملہ واضافہ نہ چاہا۔ بلکہ علاوہ برآں نذروں کی رقم جس قدر جمع ہوتی تھی وہ سب داخل خزانہ شاہی کرنے لگے چنانچہ جب سے وہی دستور جاری ہو گیا ہے۔ ورنہ سابق کے وزرا جو نذریں لیتے تھے وہ انھیں کا حق سمجھا جاتا تھا اور اپنے صرف میں لاتے تھے۔

چونکہ تقسیم ماہوارات ماہ بماہ کا انتظام اہم ترین امور تھا اور برآیندہ تنخواہ سالہاسال بابتہ زمانۂ سابق کی ادائی بھی سخت مشکل تھی لہذا یہ حکم دیا کہ جملہ ملازمین جمعیت وغیرہ بقایا سے دستبردار ہوں اور آیندہ سے بہ تخفیف دہ روزہ تنخواہ ماہ بماہ لیتے رہیں۔

نواب صاحب مغفور نے اپنی پچیس ہزار تحریر دیوانی میں سے دس ہزار جو تخفیف کئے تھے اس میں علاوہ ہمدردی ریاست کے یہ مصلحت بھی تھی کہ ملازمین سرکاری کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ اگر خیر خواہِ ریاست ہیں تو اپنی تحریر دیوانی کیوں برابر لے رہے ہیں اس کو تخفیف کیوں نہ فرمایا۔

الحاصل جمعداران وسلحداران مہدویہ وغیرہ بقایا کی دستبرداری و تخفیف تنخواہ سے چند روز ناراض رہے۔ ان میں کے ایک جمعدار جنید خان نامی نے جو سراج الملک مرحوم کے وقت سے توسل رکھتا تھا حسب ایما و رضائے مغفور ممدوح سے کہا کہ آخر کب تک بغیر تنخواہ گھوڑوں کو ہم پالیں اور تکلیف میں مبتلا رہیں

ایک استعجاب شادی آمیز ہوتا رہا۔
مغفور نے اس حسن عمل کو تا دم زیست تیس برس تک جاری رکھا اور جملہ ملازمین سلطنت کو ماہ بماہ تنخواہ پانے کا عادی کر دیا کہ بعد مغفور موصوف ہر مدار المہام کو اس حسن عمل کا جاری رکھنا لازم ہو گیا۔ بلکہ جملہ امرائے سلطنت کو بھی یہ حسن عمل لازم ہوا ہے۔ جو امیر اس کے خلاف معمل ہوتا ہے یعنی ملازمین کی تنخواہ ماہ بماہ نہیں دیتا ہے تو اس کے کارخانہ کا ذکر برائی سے کیا جاتا ہے۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو مغفور نے واقعی یہ بڑا کام کیا۔ بیچارے منصبدار وغیرہ اس فلاکت سے جس کا بیان حالات زمانہ سابق میں کیا گیا ہے نجات پا گئے۔ رفاہیت کی صورت دیکھی حوصلے بڑھ گئے۔ صرف تمثیلاً بطور مشتی از خروارے اندکے از بسیار اس امر کا ذکر کیا جاتا ہے کہ زمانۂ سابق میں سوائے امرا و ذی مقدرت کے دوسرا کوئی اپنی دختر کے جہیز میں چاندی کا پلنگ نہیں دے سکتا تھا اب بفضلہ تیک روپیہ تیس چالیس روپے ماہوار دار بھی چاندی کا پلنگ دیتا ہے۔ یہ برکت اسی ماہ بماہ تنخواہ پانے اور ساہوؤں کے ہاتھوں سے چھوٹ جانے کی ہے۔

الغرض ہنوز انتظامی مشکلات کامل حل نہ ہوئے تھے کہ مغفور کے لیے عجیب نازک وقت اور ہجوم افکار کا زمانہ آیا یعنی غفران منزل سا قدردان مالک اور بادشاہ کی رحلت اور جمعداران عرب جو اس وقت کمال زور پر تھے ان سے مغفور کا بر سر حساب ہونا اور واگزاشت تعلقات کی بنا اور ادھر دہلی میں جو غدر ہوا ہے

شاہی انتخاب اس کا نام ہے۔ الحاصل ایک عرصے تک اس خوش دلی کے آثار ملازمین سلطنت سے پیدا تھے۔ اگرچہ اس کے سوائے اور بہت سے انتظامات ریاست باعث رفاہ عام وموجب آرام انام وقوع میں آئے لیکن ابتدا ہی میں اس ماہ بماہی تنخواہ کے حسن عمل نے ایسا نقش دلوں پر جما دیا کہ بیساختہ ہر ایک کی زبان سے دعا نکلنے لگی اور عام رضامندی پھیلی۔

ایک قدیم بزرگوار مولوی سید عطاء اللہ صاحب منصبدار ساکن محلہ نور الامرا کا بیان ہے کہ جس وقت ابتدائی تقسیم تنخواہ منصب کی خبر نقیب نے دی ہے مجھ کو باور نہ ہوا بلکہ یہ سمجھا کہ شاید کسی نے مزاح کی ہے لیکن پھر دل میں آیا کہ دیکھوں تو سہی۔ جاکر دیکھا تو واقعی روپئے تل رہے ہیں تقسیم ہو رہی ہے۔ منصبدار رومالوں میں رقم باندھ باندہ کرلے جارہے ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ شکر ہے اللہ نے یہ دن بھی دکھلایا۔ تاآنکہ میرا نام بھی پکارا گیا اور مجھے ماہوار ملی۔ کچھ نہ پوچھئے اس وقت کی خوشی کا حال تقسیم پر سے آتے ہوئے کچھ پارچہ وغیرہ عیال واطفال کے لئے بازار سے خرید لیا کہ خدا جانے پھر کب تقسیم ہو۔ جب دوسری تقسیم کی خبر ملی تو دل نے کہا یہ تو بیشک کسی نے مذاق کیا ہے۔ پرسوں تقسیم ہوئی ہے دس پانچ روز میں پھر یہ تقسیم کیسی۔ اصل یہ ہے کہ تقسیم تنخواہ برسوں میں ہوتی تھی اس کے مقابل میں یہ ایک مہینہ ایسا معلوم ہوا کہ چند روز گزرے ہیں۔ الحاصل جب دفتر تقسیم پر گیا تو دیکھا واقعی تقسیم ہو رہی ہے۔ اسی طرح چند ماہ تک ہر تقسیم پر

کشت و خون ہوگا اور یہ روہیلے وغیرہ اوباش بلدہ ہی میں لوٹ مار شروع کردیں گے لہذا بکمال دانائی و دور اندیشی ان بلوائیوں کے متعرض نہ ہوئے مگر یہ کیا کہ پیش از پیش کرنل ڈیوڈسن رزیڈنٹ بہادر کو مطلع فرمادیا کہ اپنی حفاظت کا انتظام کرلیں اور بلا رعایت ان بدمعاشوں کی سرکوبی کریں۔

از بسکہ ان دنوں میں ہر جگہ چرچے غدر دہلی کے تھے اور دہلی میں عیسائیوں کا مع عیال و اطفال مارا جانا مشہور ہو گیا تھا جس کے باعث خود سرکار انگریزی متزلزل و کمزور تھی اور یہاں کے تمام عیسائی نہایت پریشان تھے کہ دفعتاً اس ہنگامے کی خبر چھاونی میں پھیلی۔ رسالہ رویداد حیدرآباد دکن سے ظاہر ہے نیز بعض مسن لوگ اس زمانے کے بیان کرتے ہیں کہ عیسائی عورتیں اور لڑکیاں گل رخسار اپنے اپنے بنگلوں سے نکل کر مانند ابر بہار اشک ریزاں حواس باختہ افتاں و خیزاں رزیڈنٹ بہادر کی کوٹھی میں پناہ لینے کو چلی جا رہی تھیں۔

رزیڈنٹ بہادر نے بمجرد اطلاع ہنگامہ مذکور کوٹھی کی فوج کو مستعد کرلیا اور سکندرآباد سے بھی جمعیت آگئی میجر برگس نے دو توپیں کوٹھی کے دروازہ غرب رویہ کے باہر لا کر لیس رکھا تا آنکہ بلوائیوں کی فوج یعنی آگے روہیلے اور ان کے پیچھے شہر کے اوباش۔ کوئی سپر تلوار لئے بشاش۔ کسی کے پاس کہنہ بندوق اکثر نو لٹیں اور بانسے لئے ہوئے دین دین کہتے ہوئے گولی گوڑہ تک پہنچے۔ طرہ بازخاں کے خاص خاص جانباز سب سے آگے پتلیوں کی

اس کے چرچے تمام حیدرآباد میں ہو رہے ہیں کہ اہل دہلی نے تمام انگریزوں کو قتل کر ڈالا اب وہاں نام کو انگریز نہیں رہا۔ ہر ملک کے اوباش لٹیرے تو ایسے موقع کے آرزومند رہتے ہیں لہذا یہاں کے اوباش بھی باہم مشورے کرنے لگے کہ اب اچھا وقت آیا ہے۔ اورنگ آباد کے چند مفسد متعلق غدر جو یہاں آکر گرفتار ہوئے تھے انھیں مغفور نے سرکار انگریزی کے حوالے کر دیا تھا تو یہاں کے عوام الناس کو سخت ناگوار ہوا تھا اور اندرونی طور پر ہر ایک کو جوش جہاد پیدا ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ حضور پر نور مغفرت مکان اور مدار المہام مغفور کو دہمکی دی گئی کہ انگریزوں سے اس وقت جہاد نہ کیا جائے گا تو ہم شاہ و وزیر کی جان کا لحاظ ہرگز نہ کریں گے مگر آفریں ہے رئیس و دیوان پر کہ ہراس کو مطلق پاس آنے نہ دیا اور کمال استقلال سے بندوبست رکھا۔ فوج باقاعدہ تو اس وقت نہ تھی لامحالہ عربوں کے جمعداروں کی تالیف قلوب کر کے جملہ دروازوں پر شہر کے عرب بٹھا دیے گئے اور حکم دے دیا گیا کہ جس کو ہنگامہ آرا دیکھو گولی مار دو۔ باوجود اس اہتمام کے طرہ باز خان برفاقت مولوی علاء الدین پانسو رہیلے فراہم کر کے آمادہ ہنگامہ آرائی ہو گیا چنانچہ ماہ شوال روز جمعہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں دوپہر کے بعد دہلی دروازہ کی راہ سے مع ہمراہی چلا۔ اوباش بلدہ تو ایسے وقت کے منتظر ہی تھے ہر ایک سمت سے جوق جوق نکل کر ان میں شامل ہونے لگے تاآنکہ رفتہ رفتہ پانچ ہزار کے اندازہ میں وہ مجمع ہو گیا۔ مغفور اول نے دیکھا کہ اگر اس ہنگامے کو رد کیں تو لامحالہ

نواب صاحب مغفور نے طرّہ بازخاں اور مولوی علاء الدین کی گرفتاری کے لئے بنام تعلقداران ممالک محروسہ احکام جاری کئے اور اشتہار دیا کہ ان دونوں کو جو گرفتار کرلائے گا ہر ایک کے لئے پانچہزار روپے انعام دیا جائے گا۔ طرّہ بازخاں کی خبر اپنے نواح میں نرکھوڑہ کے زمیندار نے جو پائی تو اپنے سپاہیوں کو لے کر پہنچا۔ زندہ گرفتار ہونا ممکن نہ تھا اس لئے طرّہ بازخاں کی ران پر گولی ماری جس سے وہ گر کر پھر اٹھ نہ سکا اور گرفتار ہو کر سرکار میں آیا۔ سرکاری طور پر اس کا علاج ہوا روزانہ دو روپے اس کی خورونوش کے لئے مقرر ہوئے تھے اور زخم اس کا چنگا ہو گیا تھا مگر لنگ باقی تھا بایں ہم ایک روز موقع پاکر قید سے نکل گیا۔ تا آنکہ ۱۲۷۵ھ میں تعلقہ توپران کے راستے پر مرزا قربان علی بیگ تعلقدار کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کی لاش یہاں آئی اور دفن کردی گئی۔ سنا گیا کہ طرّہ بازخاں تعلقہ توپران کی ایک باولی میں پانی پینے کی غرض سے اترا تھا تعلقدار مذکور نے موقع پاکر باولی پر سے گولی ماردی ہنگامۂ مذکورِ بالا کے بعد کئی روز تک سکندرآباد کی فوج بغرض حفاظت رزیڈنسی میں رہی۔ نیز نواب صاحب مغفور نے بھی غالب جنگ جمعدار کے علاقہ کے عربوں کو چھاونی کی حفاظت کے واسطے چند روز متعین فرما دیا تھا۔ اسی عرصہ میں علاء الدین مفرور مذکور بھی گرفتار ہوا۔ اس کو بعبور دریائے شور حبس دوام کی سزا دی۔

باولی کے پاس پہنچتے ہی ایک توپ گویا سلامی کی میجر موصوف نے سر کی۔ مگر ازراہ انسانیت پہلے ہوائی فیر کیا کہ ڈر کر پلٹ جائیں۔ جب دیکھا کہ بدمعاشوں کو مطلق اثر نہ ہوا اور وہی جسارت باقی ہے تو دوسرا فیر اس مجمع ناجائز پر کیا جس سے کئی مر گئے اور کئی مجروح اپنے خون میں لوٹنے لگے۔ یہ دیکھ کر بقیہ جانبازان طرہ باز خاں نے مرزا ثابت علی کے مکان میں جو وہیں واقع ہے پناہ لی۔ اور بندوقیں سر کرنے لگے۔ عقب کے دین دین کہنے والے جو تھے انھوں نے دیکھا کہ لوٹنا تو نہیں ہے یہاں اپنے خون میں لوٹنا ہے۔ بانسے پھینکدئے اور جوتیاں ہاتھ میں لیں اور سیدھا اپنے گھر کا راستہ لیا۔ چونکہ اس وقت میں ایسے مکانات حائل نہ تھے بلکہ اکثر میدان تھا اس لئے گھبرا گھبرا کر پیچھے دیکھتے بھی تھے کہ مبادا کوئی گولا یہاں تک آئے اور بھاگے جاتے تھے۔

طرہ باز خاں اور ہمراہیوں کو یہ سوجھی کہ مرزا ثابت علی کے مکان میں سے دیواریں پھوڑتے ہوئے کوٹھی کے دروازہ تک پہنچ جانا چاہئے۔ چنانچہ جب محمد اعظم علی خاں کے بنگلے کی دیوار توڑنے لگے تو خان مذکور نے فی الفور رزیڈنٹ بہادر کو خبر کردی۔ بہادر موصوف نے حفاظت کے لئے چند سپاہیوں کو بھیج دیا۔ اس عرصہ میں شام ہوگئی۔ باغیوں نے دیکھا کہ یہاں کامیابی کی امید نہیں لہذا صبح تک بتیس زخمی اور بسمل کو چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔

کیاکہ پیر و مرشد یہاں مطمئن تشریف فرماہیں حالانکہ انگریزی فوج پیر و مرشد کے لئے بیرون بلدہ ندی میں آگئی ہے اعلیحضرت کے دل میں چونکہ پہلے ہی سے معاندوں نے اس قسم کی توہمات پیدا کر رکھے تھے۔ اس خبر بے اصل کو سماعت فرمانے کے بعد پھر کیا تھا مخبران کاذب کے قول کا یقین ہوگیا اور فی الفور سواری طلب فرماکر بہ کمال عجلت بلا جلوس سواری ایوان شاہی میں داخل ہوگئے اور حسب الحکم اقدس جملہ محلات مبارک اسی وقت واپس روانہ ہوگئے۔

مقام غور ہے کہ یہ خبر ملالت اثر دفعتاً پہنچی ہوگی تو مختار الملک مغفور کے دل کو عین شادمانی میں کیا صدمہ اور کس قدر رنج و ملال ہوا ہوگا۔ اگرچہ بعد ازاں ان مفتریوں کو جو اس ضیافت و مسرت شاہ و وزیر کے مخرب ثابت ہوئے حسب مناسب سزائیں دی گئیں۔ قلعہ گولکنڈہ میں مقید ہوئے لیکن عین ضیافت میں اس بے لطفی کا ملال خاطر مغفور کو جو ہوا تھا وہ کیونکر رفع ہوسکتا تھا۔ تاریخ مہمانی موصوف مسمی محمد امین نے خوب کہی ہے۔ اس لئے درج ذیل ہے

قطعہ

زہے نواب مختار الممالک	کہ از جبہش عیان شانِ وزارت
جواں سال و جواں دولت جواں بخت	گرامی گوہرِ کانِ وزارت
نمودہ شاہ خود را مہماں نے	بصد تزئین برخوانِ وزارت

سنہ ۱۲۷۴ میں مغفور اول جو مورد عنایات تھے نوبراہ عزت افزائی و قدر دانی
مغفرت مکان نے دعوت قبول فرماکر مع محلات مبارک رونق افزائے
محل وزارت ہوئے تھے چنانچہ مغفور نے اپنی سکونتی جملہ حویلیاں باغ بارہ دری
فرش و شیشہ آلات و فرنیچر وغیرہ سے آراستہ کردے کر خود مع زنانہ منڈی والے
مکان میں فروکش ہوئے تھے جلوخانہ کے اندرونی دروازے سے لے کر بارہ دری
کی پھاٹک تک سراپچے نصب کردئے گئے تھے لہذا چھتہ کی حویلی اور بارہ دری
ایک ہوگئی تھی۔ محلات شاہی کی مستورات حویلی مذکور سے بارہ دری میں بلا تامل
جاتی آتی تھیں۔ بارہ دری میں نوچمن کے دونوں جانب انگور کے منڈوے
جو نہایت طولانی تھے ان میں بحسن اتفاق انگور کی فصل ہونے کی وجہ سے تمام
خوشوں کو سنہری اور رد پہلی بادلے کی تھیلیاں پہنادی گئی تھیں۔ اور بیچ کے
نو چمنوں میں لالہ نافرمان لہلہا رہا تھا عجب لطف و طرفہ بہار تھی۔ چونکہ باغ
بارہ دری لب رود موسٰی واقع ہے اس لئے مغفور نے بغرض حفاظت محلات
شاہی رود موسٰی کے اس کنارے پر پہرہ بندی کا انتظام کیا تھا اور پہرہ والوں
کے لئے راوٹیاں وغیرہ جابجا نصب تھیں۔

الغرض اعلیحضرت مع محلات مبارک رونق افزا ہوکر تین یا چار روز
گذرے تھے اور نہایت اہتمام سربراہی مہمانداری میں ہورہا تھا کہ حاسدان
ومعاندان فتنہ انگیز کے دلوں میں آتش حسد بھڑکی اور دفعتاً حاضر ہوکر عرض

خبر دی کہ تمھارے شہر کے مختار الملک کا انتقال ہوگیا۔ اور کہا کہ ہر چند مجھ میں اور ان میں صفائی نہ تھی لیکن ان کے انتقال کا مجھ کو افسوس ہوا بعد ازاں یہ بھی کہا کہ تمھارے شہر کے باہر مولا علی کا جو پہاڑ ہے ویسا پہاڑ اب ان کے انتقال سے ریاست حیدرآباد پر گرا ہے سمجھو۔

ٹوینڈی صاحب دراصل دانایان فرنگ سے اور یہاں ایک مدت تک مددگاری پر رزیڈنٹ بہادر کی معمور تھے لہذا مختار الملک مغفور کی دانائی و فراست کو خوب جانتے تھے اور باوجود مخالفت جو بات حق تھی کہہ دی۔ ہر شاطر ماہر کو مقابلہ کے شاطر ہی جانتے ہیں کہ کس پایہ کا ہے۔ ملاحظہ ہو مرقعہ عبرت کہ یورپ کے وزرا و عقلا نے تحریرات و تقریرات میں مغفور کی نسبت کیا کہا اور کس پایہ کا عقلمند مانا ہے اور کس درجہ خیر خواہ اپنے ملک و مالک کا جانا ہے۔ نیز زمانۂ رحلت مغفور میں ایک اخبار کا یہ مضمون ہے کہ مسٹر بیلی ممبر پارلیمنٹ جس کو لوگ نواب صاحب مغفور کے دوستوں میں شمار کرتے تھے اس نے بعد تحقیق خبر رحلت نواب صاحب مغفور اہل پارلیمنٹ سے کہا کہ اب سمجھنا چاہئے کہ ہندوستان پر ہمارا کامل تسلط ہوا ہے ورنہ سر سالار جنگ سا شخص مدبر موجود رہنے تک ہمارا تسلط لائق اطمینان نہ تھا۔

الحاصل جب اس بدبخت نے دیکھا کہ فرامین سے کام نہ نکلا تو فی الفور تلوار میان سے کھینچ لی اور مغفور پر حملہ کیا۔ فتح علی خانساماں نے جس کا ذکر واقعۂ مهدویان

بآئینِ شہاں جشنِ ضیافت	مہیا شد ز سامانِ وزارت
پسندِ شاہ گشتہ خدمت او	خلائق ہم ثنا خوانِ وزارت
چو کردم عرض بہرِ سالِ فرخ	حضورِ سرو بستانِ وزارت
چہ خوش تاریخ آن برجستہ فرمود	شہم آمد بر ایوانِ وزارت

بتاریخ ۱۹ ماہ شعبان سنہ ۱۲۷۵ھ مطابق سنہ ۱۸۵۹ء ایک اور واقعہ عظیم وقوع
میں آیا۔ یعنی کرنیل ڈیوڈسن رزیڈنٹ بہادر اور مغفور اول حضوری دربار سے
فارغ ہوکر ہاتھ میں ہاتھ ملائے ہوئے نکل رہے تھے ایک شخص جہانگیر خاں نام
نے غضب کیا یعنی ہر دو معززین موصوفین پر قرابین فیر کر دی۔ حافظ حقیقی
نے اُن دونوں معززین پر فضل کیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ رئیس و ریاست پر اپنا فضل
فرمایا۔ تھوڑی سی سمجھ رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ خدانکردہ اگر رزیڈنٹ
بہادر کی جان کا ضرر ہوتا تو نتیجہ اس کا کیا ہوتا۔ آیا جہانگیر خاں اور اس کے
مغویوں کو اتنی بھی سمجھ نہ تھی کہ اگر مختار الملک بہادر سا وزیر باتدبیر و خیر خواہِ
سلطنت کی ہلاکت بھی کچھ کم مضرت رسانِ ریاست نہ تھی۔ لیکن اُس کو
کورفہم کیا جانتے اس کے جاننے والے عقلا تھے چنانچہ استاد نواب صاحب مغفور
میر روشن علی خاں شہسوار کے داماد میر قاسم علی منصبدار مع چند ساکنین مغلپورہ
انتقال نواب صاحب مغفور کے چند روز قبل یہاں سے روانہ کربلا معلی ہوچکے
تھے بغداد میں پہنچ کر ٹویڈی صاحب سے ملاقی ہوئے صاحب موصوف نے

مرقعۂ عبرت میں مرقوم ہے کہ نواب صاحب مغفور کے ایک ہمراہی نے قبل اس کے کہ قرابین فیر ہو اس کا منہ پھیر دیا اور اسی وجہ سے یہ دونوں صاحب محفوظ رہے۔ اسی زمانے میں مولّف نے یہ سنا کہ عین فیر کرنے کے وقت کسی نے قرابین پر زور سے ہاتھ مار دیا جس کے باعث قرابین کا منہ زمین کی طرف جھک گیا۔ بہرحال اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس شخص کی بدنصیبی پر افسوس ہوتا ہے کہ ایسا کارنمایاں کر کے بغیر صلہ و انعام روپوش و گمنام رہا۔ الحاصل بفضل خدا ہو ایک موٹا چھرّا امیر نہتور علی صاحب کے پاؤں میں لگا تھا۔ ظالم نے قرابین میں خدا جانے کیا کیا بھر رکھا تھا۔ علاوہ چھرّے اور گولیوں کے پارہ بھی تھا کیونکہ حاجی جمال محمد سراج الملک مرحوم کے وقت کا شاگرد پیشہ جو مغفور کے ہمراہ تھا۔ ذکر کرتا تھا کہ بعد رفع انتشار جب ہم سب نواب صاحب کے پاس جمع ہو گئے تو مجھ کو دیکھ کر نواب صاحب مغفور نے فرمایا تھا تمھارے منہ پر کیا لگا ہے۔ میں نے رومال سے پونچھ کر دیکھا تو پارہ تھا۔ شاید دور رہنے کی وجہ سے پارہ سرد ہو گیا تھا اس لئے جلد پر جم کر رہ گیا۔

المختصر اعلیحضرت نے ملاقات کے مکان میں رزیڈنٹ بہادر اور نواب صاحب مغفور کو دوبارہ طلب فرما کر بعد کلماتِ تاسف و ہمدردی رخصت فرمایا۔ مغفور اپنی ہمراہی فوج کے ساتھ رزیڈنٹ بہادر کو ان کی کوٹھی میں پہنچا کر اپنے دولت سرا میں واپس آئے۔ جس وقت نواب صاحب اور رزیڈنٹ بہادر ہاتھی پر سے

وسراج الملک مرحوم میں آچکا ہے بیچ میں آکر اس کے وار کو روکا۔ پھر تو حملہ ہمراہیان مغفور اس پر ٹوٹ پڑے۔ اگر یہ وار چھلنا اس کے جسم میں نہ ہوتا تو ٹکڑے ہو جاتا۔ بسبب چھلتے کے جو ایک خاص قسم کا تھا تلواریں پورا کام نہ کرسکیں۔ چنانچہ میر تہور علی صاحب نے بھی جو بعد ازاں مخاطب بہ جلال الدولہ بہادر ہوئے ہیں۔ وار کیا تھا تو تیغہ ان کا اس کے چھلتے میں در آکر پھنس گیا تھا۔ اس میں سے بدقت نکالا گیا۔ چنانچہ وہ تیغہ اور ایک قدیم کتاب مصنف کے قلم کی جس پر کسی بادشاہ کے ہاتھ کی تحریر بھی تھی یہ ہر دو چیزیں محبوب یار جنگ مرحوم نے بطور تحفہ و یادگار وکٹوریہ میموریل (نمایش گاہ) میں جس کا آغاز لارڈ کرزن کے عہد میں ہوا تھا پیشکش کر دیا۔ بزمانہ لارڈ منٹو۔

الحاصل زخمی ہونے کے بعد گرفتار ہوا۔ مغفور کے بعض ملازمین جو ہمراہ تھے بیان کرتے ہیں کہ وہ وقت بھی ایک عجیب حشر نما تھا۔ ایک کی خبر ایک کو نہ تھی۔ باوجودیکہ رزیڈنٹ بہادر اور نواب صاحب مغفور ہاتھ میں ہاتھ لئے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت دونوں صاحب دو طرف ہو گئے۔ اندر کے اور باہر کے لوگ جمع ہو کر ایک مجمع عظیم ہو گیا تھا۔ جب جہانگیر خاں گرفتار ہو گیا تو نواب صاحب مغفور کو ہم نے دیکھا کہ بہ کمال پریشانی ہر ایک سے پوچھ رہے تھے کہ بڑے صاحب کہاں ہیں۔ جب بڑے صاحب صحیح و سالم مل گئے تو اس وقت مطمئن ہو کر ہاتھ میں ہاتھ ملا لیا۔

آقا (مختار الملک بہادر) کے پہنچ کر سرگین کبوتر کو اپنے رومال میں لے لیا۔ یہ حسن خدمت خانساماں مذکور دیکھ کر نواب وقار الامرا بہادر نے نہایت تحسین و آفرین کی اور فرمایا کہ ایسے کو صرف جان نثار نہیں بلکہ اپنے آقا کا عاشق زار کہنا چاہئے۔ ایسے جان نثار کسی کو نہیں میسر ہوتے۔ خوش قسمتوں کو ملتے ہیں۔

جب جان نثاریاں خانساماں مذکور کی بیان کی گئی ہیں تو اس کے آقاؤں کی قدردانیوں کو بھی بیان کرنا لازم ہوا۔ ناظرین کو یہ نہ خیال نہ ہو کہ ایسے جان نثار کی قدردانی بھی ہوئی یا نہیں۔

واضح ہو کہ علاوہ عطایائے نقد و جنس جن کی تفصیل اس وقت کیونکر معلوم ہو سکتی ہے ایک یہ صلہ و سلوک ظاہر و بین ہے کہ سراج الملک بہادر نے اپنی جاگیرات میں سے آٹھ دس ہزار روپیہ محاصلی جاگیر خانساماں مذکور کو عطا فرمائی تھی۔ اور اپنی ڈیوڑھی کے متصل اپنے علاقہ میں مکان عالیشان بنوا دے کر اپنے نزدیک اپنے جان نثار کو رکھا تھا۔ بعد سراج الملک مرحوم نواب مختار الملک بہادر بھی بہت قدردان اس کے رہے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ روبرو فتح علی مذکور کے اس کے فرزند بندہ علی نے قضا کی۔ صرف ایک لڑکا بندہ علی مذکور کا یٰسین علی نام تھا سو بعد اپنے جد کے بجائے جد خود ہمراہی میں نواب صاحب مغفور کی رہنے لگا۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ یٰسین علی کو سراکی شکایت ہے تو مغفور نے اس کو نوکری معاف کر دی اور عنبر علی خانساماں کو اوچ بکس پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ بعد مغفور کے جب

اترے ہیں تو رزیڈنٹ بہادر کی میم صاحبہ جو منتظر و مضطر استادہ تھیں آگے بڑھ کر نواب صاحب سے ہاتھ ملایا اور نہایت شکریہ ادا کیا۔

واضح ہو کہ مجرم سے بہت کچھ استفسار کیا گیا لیکن اس بدمعاش نے سوائے بے اصل حیلوں کے اصل مطلب کو اصلا نہ بیان کیا اور بسبب جراحات کاری کے چند روز میں مرگیا۔

فتح علی خانساماں مذکور بھی اگر انصاف سے دیکھا جائے تو واقعی فدائی وجان نثار دلی مغفور کے گھر کا تھا۔ خانساماں مذکور کے متعلق ایک اور واقعہ یاد آگیا ہے اگرچہ ان جان نثاریوں کے بعد جن کا بیان ہو چکا ہے اس واقعہ کی کوئی وقعت نہیں ہے اور ایک ادنیٰ بات ہے لیکن جان نثاران ذی عقل و فہم زمانۂ حال و استقبال کے لئے ایک اعلیٰ سبق ہے۔ اگر در خانہ کس است یک حرف بس است۔ واقعہ مذکور یہ کہ ایک روز ایوان شاہی میں بغرض دربار نواب مختار الملک بہادر و مہاراجہ نرندر پیشکار بہادر اور نواب محمد رشید الدین خان فخر الامرا بہادر وغیرہ امرائے پائیگاہ بانتظار برآمدی حضور پرنور حاضر تھے۔ دفعتاً دیکھتے کیا ہیں کہ فتح علی خانساماں اپنے مقام سے گوشۂ رومال پھیلایا ہوا جھپٹا اور مختار الملک بہادر کے سر پر کوئی چیز اوپر سے آرہی تھی اس کو اپنے رومال میں لے لیا اور اپنے مقام پر جاکر پھر کھڑا ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ جنگلی کبوتر جو اوپر بیٹھا ہوا تھا اس پر خانساماں مذکور نے نظر رکھی تھی۔ جب دیکھا کہ وہ بیخال کرنے کو ہے تو بکمال تیزی قریب اپنے

دستار پر سے گذر گئی اور جانب راست کے آئینہ کو توڑ کر باہر جو سپاہی بوچہ کا تھا اس کے سینہ و گردن کے درمیان لگی آفرین ہے سپاہی مجروح مذکور پر کہ زخمی ہوتے ہی بندوق فیر کرنے والے کی جانب دوڑا اور اس کو گرا کر سینہ پر چڑھ بیٹھا اور جنبیہ کھینچ کر چاہتا تھا کہ مارے مگر اس عرصہ میں بے ہوش ہو گیا۔ ساتھ ہی اس کے دوسرے سپاہی بھی پہنچ گئے۔ قریب تھا کہ وہ مجرم مارا جاتا مگر نواب صاحب مغفور نے حکم دیا کہ اسے قتل نہ کرو زندہ گرفتار کرلو لہذا گرفتار کر کے مغفور کے دولت سرا پر لے گئے چب کہ سواری مغفور کی بارگاہِ شاہی پر پہنچی اور اتر کر داخل دربار ہوئے چونکہ اس واقعہ کی خبر ہو گئی تھی اعلیحضرت مغفرت مکان نے کمال عنایت سے کیفیت پوچھی اور بلا ٹل جانے کا شکر خدا فرمایا۔

دربار سے واپس آ کر مغفور نے مجرم کو کوتوالی بھیجا۔ ہرچند اس سے برفق ومدارا پوچھا گیا کہ تو نے یہ حرکت کس کے اغوا سے کی مگر اس نے بھی کسی کا نام نہ بتلایا نواب صاحب مغفور کا قصد تھا کہ چند روز اور اس کو رہنے دیں لیکن اعلیحضرت نے ازبسکہ بہ کمال مرحمت خداوندی اپنے خیر خواہ وزیر کے دشمن جانی کو سزا دینے اور قتل کرنے کے لئے سخت تقاضا فرمایا اس لئے اس کی گردن ماری گئی۔

الحاصل امور انتظام مالگزاری کے لئے ابتداءً ۱۳۰۱ھ میں ایک مجلس قرار پائی تھی جس کے تحت معاملات کوتوالی و تعمیرات وصفائی وتعلیمات وطبابت و

یٰسین علی نے بھی قضا کی اور اس کے گھر میں بسبب صرف اناث رہنے کے غیروں کا دخل ہوا اور یٰسین علی کی لڑکیوں نے جاگیر کو اپنی ذاتی سمجھ کر اسٹیٹ سالار جنگی کی پروانہ کی اور سرتابی کی اس لئے عنبر علی خانساماں نے جاگیر مذکور اسٹیٹ میں واپس لے لی۔ اگر پسماندگان یٰسین علی مذکور اسٹیٹ موصوف سے متوسل رہتے اور نگرانی و سرپرستی عنبر علی خانساماں میں اپنے کارخانہ کو رکھتے تو جاگیر بھی بدستور بحال رہتی اور لڑکیوں کی شادی وغیرہ بھی بآئین بہین ہو کر گھر کا انتظام خوبی کے ساتھ رہتا۔

واضح ہو کہ اوایل سال ۱۸۶۰ء میں اور ایک حادثہ سے مختار الملک بہادر کو حافظ حقیقی نے بچا لیا۔ وہ یہ کہ ۱۲۸۰ھ میں عید الفطر کا دربار تھا حسب معمول نواب صاحب مغفور بوچے میں سوار ہو کر جا رہے تھے۔ بوچہ میں نشست مانند کرسی کے ہوتی ہے چھت اس کی ڈھنکی ہوئی مثل مینس کے مگر مستطیل نہیں بلکہ قدرے مدور ہوتی ہے اور ہر دو جانب اوپر کے حصہ میں آئینے بھی نصب رہتے ہیں اس لئے اس میں بیٹھنے والا نظر آتا ہے اور بوچہ کے ہمراہی سپاہی جو خاص ڈریس کے بلند و بالا ملازم کئے گئے تھے وقت سواری اطراف بوچہ کے تھے۔ جس وقت بوچہ نواب صاحب مغفور کا چارمحل دروازے کے مقابل لاڈ بازار کے آغاز میں جس کا حال باب اول میں بیان کیا گیا ہے پہنچا تو ایک اجل رسیدہ نے بازار مذکور میں سے تاک کر بندوق سر کی۔ اس کی گولی بوچہ کے آئینہ کو توڑ کر مغفور کی

وغیرہ دو چار کوس بلدہ سے باہر جانا ہوتا تھا تو بازو پر ضامنیان باندھی جاتی تھیں اور بڑا اہتمام سفر ہوتا تھا۔ بس اس سے ظاہر ہے کہ ایسے حضرات سے تعلقات دور و دراز پر جانے کی امید کیونکر ہو سکتی تھی۔

الحاصل حسب ایمائے مغفور سررشتہ داروں نے بہت کچھ سمجھایا اور ترغیب عہدوں کی دی مگر مطلق اثر نہ ہوا۔ مغفور نے پھر یہ خیال فرمایا کہ اپنی ذات سے ہر منصب دار کی لیافت کا اندازہ کر کے ہر ایک کو حسب لیافت خدمت پر معمور کیا چاہئے۔ مگر اہل منصب خدمت کے نام سے ایسے خوفناک تھے کہ مدار المہام مغفور کے روبرو ہر ایک نے اپنی لیافت کو چھپایا۔ باوجود استعداد آپ کو بے علم و بے سواد بتلایا۔ آخر کار مغفور نے دفتر صدر محاسبی پر اشتہار چسپاں کرا دیئے کہ منصبداروں میں سے جس کو استعداد فارسی ہے وہ تحصیلداری اور جس کو کچھ بھی نوشت و خواند فارسی یا تلنگی و مرہٹی ہو وہ اپنی کا عہدہ لے الخ

اس کے بعد چھ مہینے تک انتظار کیا گیا کہ منصبداروں کو توفیق ہوگی مگر اصلا نہ ہوئی۔ آخر کار ناچار پارسیوں کو اور اہل مدراس وغیرہ باہر کے لوگوں کو معمور فرمانے لگے۔ کیونکہ انتظام ضلع بندی کے لئے عہدہ داروں کی اور عملہ جات کی لامحالہ ضرورت تھی۔ اس وقت اہل ملک میں سے معدودے چند تحصیلداری وغیرہ پر معمور ہوئے ازاں جملہ میر عبد السلام خاں صاحب ہیں جو بتدریج تحصیلداری سے ترقی کر کے صوبہ داری اور خطاب نواب معتقد جنگ بہادر سے سرفراز ہوئے۔

کاغذ ممہور و آبکاری و کروڑگیری وغیرہ تھے۔ بعد ازاں ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۲۷۵ف میں نیا انتظام جدید کی ڈالی گئی یعنی جملہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے تعلقات کو از سر نو چودہ ضلعوں اور تہتر تحصیلات پر تقسیم کر کے ہر ایک ضلع میں اوّل و دوم و سوم تعلقدار۔ اور ہر تعلقہ میں تحصیلدار مع عملہ کافی اور عملہ مال و خزانہ و تحصیل وغیرہ کے ساتھ معیّن کئے گئے ہر ایک سررشتہ کے عہدہ دار مجلس مال مذکور بالا سے لے کر مجلس مال موقوف کر دی گئی اور نگرانی امور اضلاع کے لئے ایک محکمہ مالگزاری بلدہ میں قایم ہوا۔ اس ضلع بندی کے وقت مال اور پولیس وغیرہ کی خدمتوں پر مامور کرنے کے لئے منصبدارول میں سے مغفور نے انتخاب فرمانا چاہا مگر کسی نے درخواست نہ کی۔ درخواست کیسی بلکہ پریشان خاطر ہو گئے کہ ہم اپنا گھر اور عزیزوں کو چھوڑ کر جنگل میں کیونکر جائیں چنانچہ مولف کے ایک دوست منصبدار میر ہدایت علی نام اسی زمانہ میں اضافہ ماہوار کے مستدعی تھے۔ مغفور نے انہیں تحصیلداری پر جانے کے لئے حکم تحریر فرمایا۔ یہ سنتے ہی منصبدار موصوف کو ہیبت سے بخار آگیا اور ان کے بزرگان و عزیزان گریہ و زاری کرنے لگے کہ ہمارا عزیز ہم سے جدا ہوتا ہے۔ آخر کار سفارشیں پہنچا کر حکم تحصیلداری کو منسوخ کروایا۔

اس زمانے میں جدائی و سفر کے عادی نہ ہونے کی وجہ سے اہل ملک کی یہ کیفیت تھی کہ بغرض زیارات بزرگ مثل کوہ شریف یا درگاہ بابا شرف الدین ح

ان کا بھی امتحان اسی طرح لیا مگر انھیں اہل عدالت نہ پایا بلکہ معلّمی کے لایق پا کر
مدرسہ دارالعلوم میں مدرسی پر معمور فرمایا۔

مرقعۂ عبرت سے پیدا ہے کہ ان تمام انتظامات اور اصلاحوں کی تکمیل میں مغفور
کو بڑی بڑی مشکلوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ جس قدر دقتیں اس وقت
پیش آئیں ان کا استقلال کے ساتھ سامنا کرنا مغفور ہی کا کام تھا۔ اس وقت میں
خانہ جنگیاں اور چوری ڈاکے ہوتے رہتے تھے۔ ۱۸۵۵ء میں ایک یورپین افسر
مع اپنے اہل وعیال کے بڈھن خاں کی جاگیر پر سے جا رہا تھا اس کو چوروں نے
لوٹ لیا۔ روہیلوں کی غارت گری سے صدہا گاؤں تباہ ہو گئے تھے۔ اضلاع میں
روہیلوں نے اس قدر ظلم و تعدی پر کمر باندھی تھی کہ مجبوراً ان کی سرکوبی کو کنٹنجنٹ کی
فوج بہ ماتحتی مکنزی بھیجی گئی۔ آخرالامر وہ غارت گر گرفتار ہو کر بلدہ حیدرآباد میں آئے
اور محبس میں داخل ہوئے مگر اس زمانے کا محبس تھا کہ چند روز میں ڈیڑھ سو سے
زیادہ مفرور ہو گئے۔ نواب صاحب مغفور نے ہر مفرور کی گرفتاری کے واسطے پچیس روپے
انعام کا اشتہار دیا۔

اسی زمانے میں قلعہ پر روہیلے قابض ہو گئے تھے تو راجہ راؤ رنبھا کلاں متوفی
کے فرزند رستم الدولہ بہادر منجانب سرکار عالی سرگردۂ فوج ہو کر ان پر گئے تھے مگر
خلاف حزم و احتیاط متہورانہ سوار فیل قریب حصار و فصیل پہنچ گئے تھے کہ باغیوں نے
بالائے حصار سے گولی ماری جس سے بہادر مذکور کا خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ ان کا مزار